ISSN 0974-7346

دسمبر ۲۰۲۴ء

جلد ۲۱۱ — عدد ۱۲

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY,

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۳۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۳۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۳۵۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔ ● معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر: 0504010100046001

آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

(Ma arif Section) 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۱ | ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۲۴ء | عدد ۱۲

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

اس مہینے کے شذرات بھی اسی رنگ میں آنے پر مجبور ہیں جس کا سلسلہ مہینوں سے جاری ہے، دسیوں سال سے دیکھا جاتا ہے کہ جب جب ملک میں انتخابات کا مرحلہ آتا ہے یا حکومت کی نااہلی اور ملک کی دولت پر ناجائز قبضہ کی کوئی تصویر سامنے آتی ہے تو وقتی طور پر عوامی زندگی میں نفرت، انتقام اور پھر جان، مال، آبرو کی بربادی کی آگ پھیل جاتی ہے اور اسی شور و پکار میں عوام کی نظروں سے ملک کی بربادی کی تصویر او جھل ہو جاتی ہے کہ یاد بھی نہیں رہتا کہ مسئلہ تھا کیا، سیاست کی شاطرانہ چالوں میں یہ عیب، عین ہنر بنا کر صدیوں سے آزمایا جاتا رہا ہے، مگر ملک عزیز میں اس ہنر کا پہلے وقتی استعمال اور اب روزمرہ کی زندگی میں جس طرح شامل ہوا ہے یا کیا جارہا ہے وہ محض حکومت اور اقتدار کی خواہش یا ملک کی دولت اور سرمایہ کو کسی ایک خاص طبقے کی ملکیت میں لانے اور پھر اس سے فائدہ اٹھانے تک محدود نہیں، یہ انگریزوں کے زمانہ میں مسجد اور گائے جیسے بہانوں سے مقامی فساد اور محرم اور ہولی کے جلسے جلوسوں کی وقتی ناراضی اور باہمی تصادم سے قائم ہونے والی روایت کی کڑی بھی نہیں، اس لیے ان واقعات کو دیکھنے اور ان کی تہہ میں جا کر ان کا واقعی تجزیہ کرنے کے پرانے انداز بدلنے ہوں گے۔

***

جی قطعی نہیں چاہتا کہ ہر ماہ مرثیہ خوانی کا سلسلہ جاری رہے اور سینہ کوبی اور ماتم کی مجلسیں معارف کے صفحات پر برپا ہوتی رہیں، مگر ہر روز کے اخبار اور ہر رات کی خبریں مجبور کرتی ہیں کہ ملک کے آئین، عدل وانصاف کے قوانین، شہری انتظامیہ کے فرائض اور اس سے بھی زیادہ ملک کے ضمیر اور انسانی رویوں کی بات کی جائے کہ اگر یہی منظر نامے سے غائب ہوتے گئے تو پھر خاک وخون اور انسان نما جانوروں بلکہ اس سے بھی زیادہ گم کردہ راہ مخلوق کے سوا کیا رہے گا؟

***

جب غیر ملکی قوم حکمراں تھی تو یہ کہنے میں ایک ہندوستانی مسلمان محمد علی کو کوئی باک نہیں تھا کہ "قوم کے سر پر مذہب اور دھرم کا بھوت سوار نہیں ہے، کاش ایسا ہی ہوتا آج تو دنیا طلبی کا بھوت ہمارے سروں پر سوار ہے اور وہی دنیا طلب اور خود غرض لیڈروں سے مذہب کا جامہ پہن کر ہماری سیاسی سبھاؤں اور لیگوں میں سوانگ بھرواتا ہے، لارڈ اروِن سن لیں کہ یہ صحیح نہیں ہے کہ مذہب سیاست میں مداخلت بے جا کا مرتکب ہوا ہے بلکہ سیاست ہی نے مذہب میں مداخلت بے جا کی ہے، ساری کوشش سیاسی اور اقتصادی غلبہ حاصل کرنے کی ہے"۔

***

سو سال پہلے کے برطانوی ہندوستان میں اس قسم کی باتیں کرنے اور سننے کا حوصلہ ملک اور قوم میں تھا، مگر اب جب کہ آزادی اور اپنے دستور اور اپنے قانون پر عمل کرنے اور ایک شہری ہونے کے حقوق میں مساوات و توازن کی ضمانتیں موجود ہیں، ایسے میں آمریت، جارحیت اور صریح جانبداری نے ملک کے حال سے زیادہ اس کے مستقبل پر ان لوگوں کو بے چین اور مضطرب کر رکھا ہے، جو واقعی

ملک و قوم کے محب اور خیر خواہ ہیں اور جن کے آباو اجداد کا لہو اس ملک کی سرخروئی میں شامل ہے، جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے اور ایک باعزت، باوقار آزاد اور خوددار ملک کے لیے خود کو اس طرح قربان کیا کہ غلامانہ پہچان لیے اپنے ملک میں مرنے اور دفن ہونے کی طبعی حسرت کو حسرت ہی رہنے دیا، وطن کی محبت اور اس کی عزت کے لیے سب کچھ لٹا دینے والوں کی نسل سے آج جو سلوک روا رکھا گیا ہے اس کی تازہ ترین مثال یوپی کے مشہور تاریخی قصبہ سنبھل کی جامع مسجد پر یلغار ہے ،اقتدار کا نشہ مدہوش کن ہو سکتا ہے لیکن یہ مہلک اور تباہ کن کیسے بن جاتا ہے، سنبھل کے دوچار دنوں کے واقعات نے اس کی حقیقی تصویر دکھادی، صدیوں کی تاریخی مسجد کو محض ایک عرضی پر عدالت نے سروے کے نام پر پولیس کے حوالے کر دیا، سروے کرنے والے تو عدالت کے کارندے تھے ، لیکن ان کے ساتھ ہجوم کی شکل میں نعرے بلند کرنے والے وہی عرضی گذار تھے، اس عمل کو دیکھ کر ہر انصاف پسند انسان حیران رہ گیا اور حد یہ ہے کہ امت مرحومہ سے انتساب رکھنے والے اور ہمہ وقت زبان غیر سے امت کا احتساب کرنے والے بھی حیران ہو کر کسی سازش کی بو کا احساس کرنے لگے اور واقعہ ہے کہ اچانک ایک پرامن قصبہ شعلوں میں گھر گیا، چار بے قصور نوجوانوں کی جان گئی اور ہمیشہ کی طرح جان دینے والے ہی مورد الزام بن گئے، عدالتوں پر یقین رکھنے والے بھی دیکھتے رہ گئے کہ عبادت گاہوں کے تحفظ کے خصوصی ایکٹ کے باوجود سپریم کورٹ کی یقین دہانی کا کیا حشر ہوا ؟نہیں معلوم کہ اس قسم کے واقعات کا سیلاب بلا کب تک جاری رہے گا اور شاید یہ بھی نہیں معلوم کہ ملت اور قوم کب تمام شخصی اور جماعتی تحفظات سے آزاد ہو کر خود اپنی سچی مخلص جری اور زمانہ شناس قیادت کی تشکیل میں کامیاب ہوگی، ابھی تو نفسی نفسی کا عالم ہے، جھوٹ اور مکر و فریب نے ایسے حالات میں پہلے بھی یہی کیا کہ ”یہ تو چھوٹی سی جماعت ہیں، انہوں نے ہم کو بہت غصہ دلایا ہے اور ہم سب کو ان سے خطرہ ہے“(ان ھٰؤلاء لشرذمۃ قلیلون وانہم لنا لغائظون وانا لجمیع حاضرون) لیکن یہ کہنے والے اس انجام سے بے خبر ہیں، جو ذلت و رسوائی کے سمندر میں غرق ہو کر ناپید ہو جانا ہے، کاش مظلوم امت کو اپنے نجات دہندہ کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ یقیناً صاحب عصا کا انتظار فطری ہے۔

***

یہ سطریں اضطراراً قلم کے حوالے کی گئیں ورنہ خیال تھا کہ نومبر کے مہینے میں منعقد ہونے والے دو بڑے مفید اور کارآمد علمی مذاکروں کا ذکر خاص طور پر کیا جائے، ان میں ایک مذاکرۂ علمی کبھی کے دارالاقبال شہر بھوپال کے دارالعلوم تاج المساجد میں منعقد ہوا، عنوان تھا ”تحریک ولی اللہی کے اثرات ریاست بھوپال پر“ موجودہ حالات میں شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کی یاد گویا وقت کا تقاضا بن گئی، شاہ صاحب نے مغل حکومت کے زوال اور قوم کی بربادی کا مشاہدہ کیا اور پھر قرآنی علوم اور حدیث و کلام و فقہ اور تاریخ اسلام کے احیاء کے ذریعہ گرتی ہوئی عمارت کو بچانے اور سنبھالنے کی عملی کوششیں کیں اور اس کے نتیجے میں برصغیر میں ملت کا وجود ہی برقرار نہیں رہا، اس کے اثرات نے افغانستان سے ہندوستان کے شرق بعید تک زندہ رہنے کی ایک لہر دوڑادی، ریاست بھوپال تو وسط ہند کے ظلمت کدہ

میں تنہا روشنی کی کرن تھی، جس کی تاریخ اسلام کی تاریخ میں یوں یگانہ و یکتا بن گئی کہ ریاست کی حکمرانی مسلسل، خواتین کے حصہ میں آئی اور خواتین اسلام کی لیاقت، صلاحیت اور مذہبیت کی مثال بن گئی، اس انفرادی خوبی میں رنگ شاہ دہلوی کی تحریک کا بے شبہ رہا، سیمینار میں ان فراموش سچائیوں کو بڑی محنت اور خوبی سے تلاش اور پیش کیا گیا، دو روز تک نواب سید صدیق حسن خان، مدار المہام منشی جمال الدین، علامہ حسین بن محسن یمانی، خانوادہ مجددیہ اور شاہ دہلوی کے خاندانی مفتیوں اور قاضیوں کے حوالے سے تحریک ولی اللہی کے اثرات کے ذکر نے مستقبل میں ثمرات کے حصول کی آرزوئیں اور امیدیں جگادیں، دارالعلوم تاج المساجد میں مولانا سید سلیمان ندوی اکیڈمی کے سایہ میں علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور دارالمصنّفین کے ذکر میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار کی جلوہ نمائی بھی خوب رہی، علامہ شبلی نے علم الکلام میں ابن تیمیہ کے بعد جس طرح شاہ ولی اللہ کا ذکر کیا وہ واقعی ہندوستان اور اردو کے دور جدید میں پہلی طاقتور ترین تحریر کہی جائے گی، جس میں علم کلام میں ولی اللہی اضافوں کے بارے میں لکھا گیا کہ کلام میں عقائد پر تو پہلے بھی لکھا گیا، لیکن احکام کا حصہ وہ ہے جس کو پہلی بار شاہ صاحب نے مس کیا اور اس موضوع پر کتاب لکھ دی۔ ایسے بامقصد کامیاب سیمینار کے لیے دارالعلوم تاج المساجد اور اس کے امیر پروفیسر حسان خان کے قابل ستائش ہونے میں کیا شک؟

دوسرا سیمینار رابطہ ادب اسلامی کا تھا جو جے پور کی مشہور درسگاہ جامعۃ الہدایہ میں منعقد ہوا، سرسبز پہاڑوں کے دامن میں جامعہ واقعی وادی ہدایت ہے، اس کے بانی مولانا عبدالرحیم مجددی نے جس طرح دشت و کوہسار کے اس خطہ کو آباد کیا، وہ ان کی سب سے بڑی کرامت ہے، ان کی شخصیت ہی اس سیمینار کا مرکزی موضوع قرار پائی، شخصیت کی ہمہ گیری نے سیمینار کو بھی ہمہ گیر بنادیا، ندوہ، دیوبند، علی گڑھ ہی نہیں شمال و جنوب کی متعدد نامور ہستیوں کی موجودگی نے اس سیمینار کی افادیت میں اضافہ کر دیا، مولانا بلال عبدالحی حسنی، مولانا جعفر مسعود ندوی تو رابطہ کی روح ہیں مگر جامعۃ الہدایہ کے مولانا فضل الرحیم مجددی اس سیمینار کی جان بن کر زندگی کی معنویت ظاہر کرتے رہے۔

***

ایک خبر نے البتہ مسرت کا لمحہ میسر کر دیا، خبر آئی کہ علامہ شبلی کی شخصیت اور خدمات پر مضامین نو ہی نہیں، کتب نو کا انبار لگانے والے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو غالب انسٹیٹیوٹ کے غالب انعامات میں قابل فخر فخر الدین ایوارڈ سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے، یہ مسلسل محنت اور تحقیق و جستجو کا اعتراف ہے اور یہ مزید اعترافات کی تمہید بھی ہے۔

***

ابھی ابھی مولانا طلحہ نعمت ندوی نے اطلاع دی کہ دارالمصنّفین اور شبلی و سلیمان کے عاشق ڈاکٹر عتیق الرحمن ندوی کا پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ.... آئندہ شمارہ میں ان کا ذکر ان شاء اللہ قدر تفصیل سے کیا جائے گا۔

***

مستشرقین کے قرآنی افکار پر ڈاکٹر محمد مہر علی کا محاکمہ

ڈاکٹر مجتبیٰ فاروق، حیدر آباد

mujtabafar@gmail.com

ڈاکٹر محمد مہر علیؒ (م: ۲۰۰۷) قرآنیات و سیرت کے ماہر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ آپ ۱۹۲۹ء میں کھُلنا (بنگال) میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۲ء میں تاریخ کے مضمون میں گریجویشن کی سند حاصل کی اور اس کے بعد اسی مضمون میں ۱۹۵۳ء میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران انھوں نے کئی کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دیں اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں بھی لکچرر کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں لندن کا رخ کیا اور وہاں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ آفریکن اسٹڈیز میں "عیسائی مشنری سرگرمیوں کے بارے میں بنگالی رد عمل" (۱۸۳۳-۱۸۵۷) The Bengali Reaction to Christian Missionary Activities (1833-1857) کے عنوان پر ۱۹۶۳ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے اگلے سال لندن کے لنکن اِن سے بیرسٹر کی ڈگری بھی حاصل کی۔ پھر آپ مشرقی پاکستان واپس لوٹ آئے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے The Official Historical Document Centre میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء تک معاون محقق کی حیثیت سے کام کیا۔[1] اس کے بعد سعودی عرب گئے جہاں امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی (ریاض) میں اسلامی تاریخ کے استاذ مقرر ہوئے اور وہاں بارہ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ مدینہ یونیورسٹی میں بھی انھوں نے تدریسی ذمہ داریاں انجام دیں۔ مزید بر آں انہوں نے شاہ فہد کمپلکس برائے

---

(۱) Prof. Muhammad Mohar Ali has passed away https://muslimmatters.org/2007/04/12/prof-muhammad-mohar-ali-has-passed-away (accessed on Oct. 09, 2022)۔

طباعت قرآن پاک (مدینہ منورہ) میں محقق کی حیثیت سے بھی کام کیا۔[۲] اس کے علاوہ ڈاکٹر مہر علی عالم اسلام کے مختلف علمی و فکری تحقیقی اداروں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔

اسلامی خدمات کے لیے شاہ فیصل ایوارڈ: ڈاکٹر محمد مہر علی کی علمی و تحقیقی نگارشات کے اعتراف کے طور پر ۲۰۰۰ء میں انہیں شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آپ بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے پہلے ایسے شخص تھے جنہیں اس عظیم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔[۳] ڈاکٹر مہر علی کی دینی اور علمی خدمات کا اعتراف عالم اسلام ہی نے نہیں بلکہ مغربی دنیا نے بھی کیا ہے۔ علم و تحقیق کے اس بے لوث خادم نے ۲۰۰۷ء میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔[۴] انھوں نے تحقیقی ذوق، اپنی خداداد صلاحیت اور ذاتی دلچسپی کی بنا پر ایک شاندار علمی ورثہ چھوڑا جو علم و تحقیق کی دنیا کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہے گا۔

ڈاکٹر مہر علی کی خدمات: ڈاکٹر مہر علی کو قرآن مجید سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اسی محبت اور غیرت نے انہیں قرآن مجید اور سیرت رسول ﷺ کا سچا اور بے لوث خادم بنایا۔ آپ نے دنیائے استشراق کو بہت ہی قریب سے دیکھا، سمجھا اور پرکھا اور اس کے بعد اس کی ریشہ دوانیوں اور اس کی علمی خیانتوں اور بددیانتیوں کو اپنا تحقیقی میدان بنایا۔ انھوں نے مستشرقین ہی کے تحقیقی میدان میں اتر کر علمی مقابلہ کیا اور تعصب اور جانب داری پر مبنی مستشرقین کی قرآن پاک سے متعلق نام نہاد تحقیقات کی حقیقت کو آشکارا کیا۔ قرآن مجید اور اللہ کے رسول ﷺ کی پاک زندگی پر مستشرقین کے اٹھائے گئے اعتراضات موصوف کو برداشت نہیں ہو رہے تھے۔ ان کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ عالمِ اسلام میں مستشرقین کی تحقیقات پر کام کرنے والے سنجیدہ اور باصلاحیت افراد بہت کم ہیں۔

ڈاکٹر مہر علی مستشرقین کی تحقیقات کا بہت وسیع مطالعہ اور گہرا مشاہدہ رکھتے تھے۔ قرآن مجید کا تحفظ اور اس کی حقانیت، ان کی دلچسپی اور تحقیق کا خاص موضوع رہا ہے۔ نیز مستشرقین کا رد بھی ان کی

---

[۲] Muhammad Mohar Ali https://en-academic.com/dic.nsf/enwiki/11758699 (as accessed on Oct. 09, 2022)

[۳] M. A. J. Beg, Muhammad Mohar Ali, https://www.bmri.org.uk/biogs/Muhammad-Mohar-Ali.pdf(as accessed on Oct. 09, 2022)

[۴] پروفیسر مہر علی کا انتقال ۲۰۰۷ میں ہوا:

https://muslimmatters.org/2007/04/12/prof-muhammad-mohar - ali-has-passed-away (accessed on Oct. 09, 2022)

تحقیقات کا مقصد تھا۔ اس تعلق سے انھوں نے کئی ملکوں کا علمی سفر بھی کیا، بہت سے مستشرقین سے ملے اور بے شمار لائبریوں کا دورہ کرکے علمی ذخیروں کو کھنگالا۔[۵] ڈاکٹر مہر علی نے مستشرقین کی علمی بددیانتیوں کا بلا کسی لاگ ولپیٹ کے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کی مخالفت اور جعلسازی کا عالمانہ انداز میں مدلل جواب دیا۔ اس علمی و تحقیقی ذوق نے انھیں نہ صرف برّصغیر میں بلکہ عالم عرب میں اور مغربی دنیا میں بھی متعارف کرایا۔

تحقیقات و تصانیف : ڈاکٹر مہر علی کو بنگلہ، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا لیکن انھوں نے تحقیق و تصنیف کے لیے جس زبان کو استعمال کیا وہ انگریزی زبان ہے کیوں کہ معاندینِ اسلام اور مستشرقین نے زیادہ تر اسی زبان میں اسلام کے بنیادی نصوص کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ انھوں نے نادر موضوعات پر پندرہ بیش قیمتی کتابیں تحریر کیں، جن میں ہر کتاب اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتی ہے۔ ان کی چند اہم تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ *The Qur'an and the Orientalists: An Examination of Their Main Theories and Assumptions*[۶]

یہ کتاب مستشرقین کے قرآن پر اعتراضات کے حوالے سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مستشرقین کے اعتراضات وشبہات کے مدلل ومفصل جواب پر مبنی یہ اپنی نوعیت کی قابل قدر کتاب اور تحقیق و علمیت کا ایک منفرد نمونہ ہے۔ اس میں ڈاکٹر مہر علی نے علمی و عقلی محاسن کے اثبات کی روشنی میں قرآن مجید کی حقانیت، معقولیت، اور افادیت پر مؤثر انداز میں بحث کی ہے۔

۲۔ *Sirat Al Nabi (SAW) and The Orientalists*[۷]

---

(۵) M. A. J. Beg, "Muhammad Mohar Ali," https://www.bmri.org.uk/biogs/Muhammad-Mohar-Ali pdf (accessed on Oct. 09, 2022).

(۶) Muhammad Mohar Ali, The Qur'an and the Orientalists :An Examination of their main theories and Assumptions. U.K Norwih:Jamiyat Ihyaa Minhaaj Al-Sunnah, 2004

(۷) Muhammad Mohar Ali, *Sîrat al-nabî and the orientalists*: with special reference to the writings of William Muir, D.S. Margoliouth and W. Montgomery Watt, Medina: King Fahd Complex for the Printing of the Holy Qur'an, 1997.

ڈاکٹر مہر علی کی یہ دوسری کتاب دلائل، اسلوب اور پیش کش کے لحاظ سے نہایت وقیع اور مفید ہے۔ مستشرقین نے اللہ کے رسول ﷺ کی ذات پر جو بھونڈے الزامات لگائے، ان کا دائرہ دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔ ان کا ڈاکٹر محمد مہر علی نے بھرپور تنقیدی جائزہ لیا۔ انھوں نے بطورِ خاص ولیم میور، ایس-مارگولیوتھ اور منٹگمری واٹ کے اعتراضات کا جواب دیا۔ مستشرقین نے قرآن مجید پر جدید تعلیم یافتہ مسلمان طبقے کے اعتماد اور ایمان کو متزلزل کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، متذکرہ بالا دونوں تصنیفات کے ذریعے سے ڈاکٹر مہر علی نے انہیں رفع کرنے کی کوشش کی۔

۳۔ *The Bengali Reaction to Christian Missionary Activities, 1833-1857*[۸]

یہ ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ ہے۔ اس تحقیقی مقالے میں انھوں نے بنگال میں ۱۸۳۳-۱۸۵۷ کے دوران عیسائی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔

۴۔ *History of the Muslims of Bengal*[۹]

یہ کتاب بنگالی مسلمانوں کی تاریخ پر ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۵۔ *An Outline of Ancient Indo-Pak History*[۱۰]

یہ کتاب برّصغیر کی قدیم تاریخ پر ہے جس سے ڈاکٹر مہر علی کی تاریخ نگاری کا پتہ چلتا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے بہت سے تحقیقی مقالات بھی قلم بند کیے ہیں۔

مستشرقین کے قرآن پر اعتراضات: ڈاکٹر مہر علی نے مستشرقین کا جواب ان ہی کی زبان میں دیا ہے۔ انہوں نے مستشرقین کے قرآن پر اعتراضات کا تنقیدی جائزہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں لینا شروع کیا جب وہ *Sirat al-Nabi and Orientalism* کے عنوان سے کتاب لکھ رہے تھے۔ اس

---

(۸) Muhammad Mohar Ali, *The Bengali Reaction to Christian missionary activities,* 1833-1857, Chittagong: Mehrub Publications, 1965 .

(۹) Muhammad Mohar Ali, *History of the Muslims of Bengal 1771-1871,* Ryadh: Imam Muhammad ibn Saud Islamic University, 1988.

(۱۰) Muhammad Mohar Ali, *An Outline of Ancient Indo-Pak History, East Pakistan,* Muhammad Mokhles Ali, 1960 .

کتاب کو ضبطِ تحریر میں لانے کے دوران انھیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ مستشرقین کے اعتراضات براہِ راست قرآن مجید پر ہیں، اس لئے قرآن کے حوالے سے مستشرقین کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔[۱۱] اس کے بعد ۱۹۹۹ء میں ٹوبی لیسٹر کا مضمون *Atlantic Monthly* میں "قرآن کیا ہے؟" What is the Kuran? کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ دراصل صحافتی نوعیت کا مضمون تھا جس میں جرمن مستشرق پوین Gerd R. Puin کے خیالات کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ اس نے صنعاء (یمن) کی ایک مسجد میں قرآن کے کچھ بوسیدہ اوراق دریافت ہونے کی بنیاد پر ایک مفروضہ قائم کیا کہ یہ اصلی قرآن کا ایک نسخہ ہے۔ اس پوری تحقیق کا دارومدار صنعاء میں دریافت کیے گئے قرآنی مخطوطات پر تھا۔[۱۲] ڈاکٹر محمد مہر علی نے ٹوبی لیسٹر کے اس مضمون پر تنقیدی تبصرہ لکھا جو جون ۱۹۹۹ء میں ایک کتابچہ بعنوان *The Qura'n and the Latest Orientalist Assumptions* کی شکل میں شائع ہوا۔ اس کے اگلے سال یعنی ستمبر-اکتوبر ۲۰۰۰ء میں مدینہ میں شاہ فہد قرآن پرنٹنگ کمپلکس نے قرآنی مطالعات اور علوم پر مدینہ میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں ڈاکٹر مہر علی نے عربی زبان میں قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات پر ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا۔ یہی مقالہ اضافوں کے ساتھ ۲۰۰۲ء میں *The Qura'n and Orientalists : A Brief Survey of Their Assumptions* کے عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا۔[۱۳] اس کے بعد انھیں یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ قرآن پر مستشرقین کے اعتراضات پر مفصل کام کرنے کی ضرورت ہے اور ان کے اعتراضات کا بھرپور جائزہ لینا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ڈاکٹر مہر علی نے اپنے آپ کو اس اہم کام کے لیے پوری طرح سے یک سو کر دیا۔[۱۴] ڈاکٹر مہر علی نے مستشرقین کی پوری تاریخ کو کھنگالا، ان کے علمی کام کو جمع کیا اور ان کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ چوں کہ وہ مستشرقین کے افکار اور ان کی تحقیقات میں پہلے سے ہی

---

(۱۱) Muhammad Mohar Ali, The Qur'an and the Orientalists :An Examination of their main theories and Assumptions, v۔

(۱۲) *Ibid.*, p. v.

(۱۳) *Ibid.*, p. v.

(۱۴) *Ibid.*, p. vi.

دلچسپی لیتے تھے، اس لیے انھیں مستشرقین کے قرآنی افکار کا تنقیدی جائزہ لینے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔[۱۵]

ڈاکٹر مہر علی کا طریق تحقیق : ڈاکٹر مہر علی کا کارنامہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور سیرت رسول ﷺ پر مستشرقین نے جو اعتراضات اٹھائے تھے، ان کے تعلق سے انھوں نے اصل کتابوں اور مقالات کو تلاش کر کے نہ صرف گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا بلکہ بین السطور میں مستشرقین جو پیغام دینا چاہتے ہیں، اس کا بھی حاصلِ مطالعہ پیش کیا۔ اس کے لیے انھوں نے مغربی ممالک کا سفر بھی کیا اور مغربی دنیا کی لائبریریوں کا دورہ کر کے مواد جمع کیا۔ اس کے بعد ان کا مطالعہ کر کے تنقیدی جائزہ لیا، ان کے مفروضات کا باریک بینی کے ساتھ تعاقب کیا اور براہِ راست ان کی زبان اور بالواسطہ ان ہی کی سرزمین میں انہیں جواب دیا۔ اس تعلق سے ڈاکٹر مہر علی لکھتے ہیں:

> میں نے ان سے ان کی اپنی بنیادوں پر ملاقات کی ہے اور ایک ایک کر کے ان کے دلائل اور بیانات لیے ہیں، ان کی خامیوں، ان کے متناقص اور غیر معقول دلائل کی نشاندہی کی ہے۔ پھر بھی میں دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ کام مکمل اور جامع ہے۔[۱۶]

ڈاکٹر مہر علی نے مستشرقین کے ان اعتراضات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جو بیسویں صدی میں عروج پر تھے۔ پھر تحقیق اور استدلال کے ساتھ ان کا مفصل اور مدلل جواب دیا۔ انھوں نے قرآنیات کے تعلق سے علوم القرآن کے ایک بڑے ذخیرے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، جگہ جگہ مستشرقین کی کتابوں سے حوالے دے کر ان کی لغزشوں اور تسامحات کا جائزہ لیا اور اپنا موقف مدلل انداز میں پیش کیا۔ غرض یہ کہ ڈاکٹر مہر علی کے جوابات قرآن و سیرت، علوم القرآن اور تاریخ کے علاوہ مستشرقین کی کتب کے حوالوں سے مزیّن ہیں۔

قرآن مجید کے تعلق سے مستشرقین کے افکار و خیالات ڈاکٹر مہر علی کے نزدیک تین مراحل سے گزر کر سامنے آئے:

- پہلا مرحلہ ۱۸۵۸ء سے شروع ہوتا ہے جب ولیم میور کی کتاب *The Life of Mahomet*

---

[۱۵] *Ibid.*, pp. 1-17.

[۱۶] *Ibid.*, p. 7.

شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔[۱۷] قرآن مجید اور پیغمبر اسلام کی نبوت کے بارے میں ولیم میور کے خیالات اور اس کے مفروضات کو بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک مغربی مصنفین اور مستشرقین نے اختیار کیا اور ان کے خیالات اور مفروضات کو مزید آگے بڑھایا گیا۔

- دوسرا مرحلہ بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اگرچہ پہلے مرحلے کا ہی عکس دکھایا جاتا ہے لیکن اس میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں، جب مارگولیوتھ کی کتاب *Mohammed and the Rise of Islam* منصۂ شہود پر آئی۔[۱۸] یہ کتاب چند نئے اضافوں کے ساتھ تیسری بار ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔
- تیسرا مرحلہ عصر حاضر کا ہے جب منٹگمری واٹ کی کتاب *Muhammad at Mecca* ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی[۱۹]۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب *Islamic Revelation in Modern World* کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آئی[۲۰] اور مغربی دنیا میں اپنے اثرات قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس مرحلے میں اپنے سابقین کے ساتھ ساتھ واٹ کے مفروضات اور اعتراضات نے قرآن مجید کے بارے میں مزید ابہامات کو جنم دیا۔[۲۱]

مشرکین اور مستشرقین کے اعتراضات میں مماثلت

مستشرقین کے اعتراضات وہی ہیں جو عہدِ نبوت ﷺ میں مشرکینِ مکہ قرآن پر کرتے

---

(۱۷) William Muir, *The Life of Mahomet*, London: Smith Elder and Cornhill, 1861.

(۱۸) D.S. Margoliouth, *Mohammed and The Rise of Islam*, New York and London: Putnam, 1905.

(۱۹) W.Montgomery Watt, *Muhammad at Mecca* (Oxford: Clarendon Press, 1953).

(۲۰) W.Montgomery Watt, *Islamic Revelation in Modern World* (Edinburgh: Edinburgh University Press, 1969).

(۲۱) Muhammad Mohar Ali, The Qur'an and the Orientalists: An Examination of their main theories and Assumptions, 92

تھے۔ مشرکینِ مکہ ڈھٹائی سے اللہ کے رسول ﷺ پر رکیک حملے کرتے تھے۔ ہر دور میں معاندینِ اسلام ان اعتراضات کا اعادہ کرتے رہے۔ صلیبی جنگوں کے بعد ان اعتراضات میں شدت آگئی اور ان میں اضافہ بھی ہوتا گیا۔ جلد ہی ''مستشرقین'' کے نام سے ایک بڑا ٹولہ وجود میں آگیا جنھوں نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ قرآن مجید کے خلاف کام شروع کیا۔ انھوں نے نئے قالب میں پرانے اعتراضات کو پھر سے دہرانا شروع کیا اور کہا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ محمد ﷺ کا اپنا گھڑا ہوا کلام ہے مستشرقین کا یہ اعتراض ہے کہ قرآن مجید کو توریت اور عیسائیوں و یہودیوں کی دیگر مذہبی کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ وہ کبھی یہ کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ شعراء کا کلام ہے۔ کبھی وہ قرآن مجید کے جمع و تدوین پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن مجید محمد ﷺ کے وصال کے دو سو سال کے بعد وجود میں لایا گیا، تو کبھی اس کی ترتیب پر اعتراض کرتے ہیں۔ کبھی وہ اس کی قرأت پر سوال اٹھاتے ہیں، تو کبھی اس کے بے ربط اور بے جوڑ ہونے پر۔ کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید نامکمل ہے اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ اس کی زبان و بیان صحیح نہیں ہے۔ کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ متنِ قرآن کی روایات کا انحصار زبانی روایات پر کیا گیا ہے۔ کبھی یہ شوشہ چھوڑتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں قرآن مجید کی کتابت کے تعلق سے جو روایات ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں۔ گویا کہ ان کے پاس اعتراضات کا نہ تھمنے والا ایک سلسلہ ہے۔ الغرض مشرکینِ مکہ اور مستشرقین کے اعتراضات میں کافی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مہر علی لکھتے ہیں:

> اصل مقصد یہ ثابت کرنا رہا ہے کہ قرآن انسانی ذہن اور ہاتھ کی پیداوار ہے۔ بنیادی طور پر غیر مسلموں کا یہ رویہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود قرآن۔ مکہ کے کافروں نے بھی، جو وحی کے اولین مخاطبین تھے، بالکل یہی الزامات لگائے تھے۔ ان میں کہا گیا تھا کہ یہ صرف ایک آدمی کی باتیں ہیں جو خود تو قابل اعتماد ہے لیکن وہ ایک ان پڑھ نوجوان ہے جو کہ شاعر یا جادوگر یا کوئی اور چیز بن گیا ہے اور اس نے قرآن کے حصے مرتب کر کے حفظ کر لئے تھے اور ان کو اللہ کی آیات کے طور پر بیان کیا یا یہ کہ یہ محض قدیم افسانے تھے۔[۲۲]

مستشرقین کا معاملہ مشرکینِ مکہ سے جداگانہ نہیں ہے۔ مشرکین کے قرآن مجید پر اعتراضات نے مستقبل میں معاندینِ اسلام کے لیے مزید گمراہی کے راستے کھول دیے۔ اسی لیے

---

[۲۲] *Ibid*, p. 1

قرآن مجید نے ان اعتراضات کا جواب دیا اور مشرکینِ مکہ کو چیلنج کیا کہ وہ اس جیسی کوئی آیت یا سورہ پیش کریں اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہیں۔ مہر علی لکھتے ہیں:

واضح رہے کہ قرآن کو کسی صاحب علم نے شاعری کی کتاب نہیں سمجھا اور نہ ہی نبی ﷺ نے کوئی شاعری کی۔ یہ درحقیقت قریش کے کفار کا الزام تھا جو انھوں نے وحی کی مخالفت کے ابتدائی مرحلے میں ہی کیا تھا کہ محمد شاعر بن چکے ہیں۔ لیکن جلد ہی انہوں نے پایا کہ ان کا الزام کارگر نہیں ہو رہا ہے تو انہوں نے اپنا الزام بدل دیا کیونکہ یہ ایک حقیقت تھی کہ نبیؐ ان پڑھ تھے۔[۲۳]

ولیم میور اور منٹگمری واٹ کے اعتراضات کا جائزہ: ڈاکٹر مہر علی کا کہنا ہے کہ مستشرقین کے تمام خیالات نہ صرف ناپختہ ہیں بلکہ حقائق سے بھی کوسوں دور ہیں۔ قرآن کے بارے میں ان کے افکار محض مفروضات ہیں جن کا اظہار وہ اپنے دلوں کو تسلی دینے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ علم اور تحقیق کی دنیا میں ان مفروضات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ میور نے وسیع پیمانے پر قرآن مجید اور سیرت رسول ﷺ پر الزامات عائد کیے اور اسی کے الزامات کو بعد میں واٹ نے دہرایا۔ ان دونوں کا کہنا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ پیغمبر اور لیڈر بننے کے خواہش مند تھے اور اس کے لیے انھوں نے عیسائی راہبوں سے تربیت حاصل کی۔ وہ وحی الٰہی سے انکار کرتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ وحی کا نزول اوپر سے نہیں ہوتا تھا بلکہ محمدؐ نے اس کو عیسائیوں اور یہودیوں سے مستعار لیا ہے۔ میور کا کہنا ہے کہ تجارتی سرگرمیوں کے دوران محمد ﷺ نے بہت سی معلومات یہودی دکانداروں اور تاجروں سے حاصل کیں۔ میور مزید کہتا ہے کہ محمدؐ نے عیسائیوں اور یہودیوں سے بے شمار قیمتی باتوں کو مستعار لیا ہے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ محمد نے بائبل سے عبارات، محاورات اور اسلوبِ بیان کو بھی اخذ کیا۔

مارگولیوتھ نے بھی اسی طرح کی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کہا کہ محمد ﷺ کو نبی بننے کا خیال عیسائیوں اور یہودیوں کی مذہبی کتب سے آیا۔ وہ مزید کہتا ہے کہ محمد ﷺ نے قرآن کی تمام کہانیاں بائبل سے لی ہیں اور پھر ان کو پالش کر کے ایک نئے قالب میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد

---

(۲۳) *Ibid*, p. 14.

واٹ نے اپنے سابقین کے خیالات کو دہرایا۔ اس نے بھی وحی اور اسلامی تعلیمات کو عیسائی و یہودی کتب و تعلیمات سے ماخوذ قرار دیا۔ اس نے انتہائی بددیانتی کے ساتھ الٰہی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کی(۲۴)۔ میور اور مارگولیوتھ کی طرح اس نے بھی محمد ﷺ پر یہودی و عیسائی تعلیمات کے اثر ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا کہ محمد نے یہودی و عیسائی راہبوں سے اسفار کے دوران ملاقات کر کے قرآنی تعلیمات حاصل کی تھیں(۲۵)۔ مہر علی اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ پیغمبرؑ نے ان اسفار سے فائدہ اٹھا کر کسی مخصوص راہب یا کسی عیسائی شخص سے عیسائیت کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ بحیرہ کے بارے میں مہر علی کا کہنا ہے کہ اس سے ملاقات کے موقع پر نبی محض ایک بارہ سال کے لڑکے تھے جس کی وجہ سے ان کا کسی سنجیدہ علمی بحث میں شامل ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس بات کی تاکید ضروری ہے کہ [رسول اکرمؐ کے] تجارتی اسفار ایک ایسے ملک میں ہوئے تھے جہاں عیسائیوں کی اکثریت تھی، اس لئے اس بات کا امکان نہیں ہے کہ ان کی کسی عیسائی سے ملاقات نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ [اولین] مآخذ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ نبیؐ نے ان اسفار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عیسائیت کے بارے میں کسی خاص راہب یا کسی عیسائی سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ آپؐ کی بحیرہ اور نسطور سے ملاقات کی مشکوک تفاصیل بھی اُن لوگوں کے سوالات اور آراء کا ذکر کرتی ہیں نہ کہ آپؐ کی اپنی آراء کا۔
>
> یہ بھی نوٹ کرنا ضروری ہے کہ بحیرہ سے مذکورہ ملاقات کے وقت آپؐ صرف تقریباً ۱۲ سال کے نوجوان تھے اور ایسی عمر میں اس بات کا امکان نہیں ہے کہ آپؐ نے ان سے کوئی علمی گفتگو کی ہوگی۔(۲۶)

مستشرقین کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ محمد ﷺ پیغمبر بننے کے انتہائی خواہش مند تھے اور اس کے

---

(۲۴) *Ibid*, p. 23.

(۲۵) *Ibid*, p. 134-170.

(۲۶) Muhammad Mohar Ali, The Qur'an and the Orientalists: An Examination of their main theories and Assumptions, 38.

حصول کے لئے انہوں نے کافی دوڑ دھوپ کی، عیسائی علماء اور یہودیوں کے اکابرین سے ملاقاتیں کیں اور ان سے استفادہ کیا۔ اس حوالے سے مستشرقین خاص طور پر ورقہ بن نوفل کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جب اللہ کے رسول ﷺ پر غارِ حرا میں پہلی بار وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ بہت پریشان ہوئے اور کئی دن تک آپ کی طبیعت ناساز رہی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر آپ کی رفیق حیات حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے کر گئیں تاکہ ورقہ آپ کو صلاح ومشورہ دیں۔ ورقہ بن نوفل نے آپ کا بہت عزت واکرام کے ساتھ استقبال کیا۔ وہ آپ ﷺ کو فوراً پہچان گئے اور آپ کو آنے والے دور کا ایک بہترین انسان قرار دیا۔ ڈاکٹر مہر علی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبیؐ کے اندر رسالت کا منصب حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس کے برعکس، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ورقہ نے آپؐ کو ایک مخلص اور دکھاوانہ کرنے والا شخص سمجھا۔ اس ملاقات کے علاوہ مآخذ میں کوئی اشارہ نہیں ہے کہ نبیؐ نے اس سے پہلے ورقہ سے کسی بھی مسئلے پر کوئی مشورہ کیا ہو حالانکہ حالات بتاتے ہیں کہ یہ سمجھنا بہت معقول ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو قریب سے جانتے تھے۔[۲۷]

مستشرقین کا ایک مشترکہ مفروضہ یہ بھی ہے کہ محمد ﷺ کو مکہ کے لوگوں کی تکلیف دہ حالت برداشت نہ ہوئی جس کی وجہ سے خدا اور وحی کے حوالے سے ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ آپ ﷺ کو اپنے قوم کا سردار اور لیڈر بننا چاہیے۔ یہ خیال زمانے کے نشیب و فراز سے پختہ تر ہوتا گیا۔ اسی خیال کو محمد ﷺ نے چالیس سال کی عمر میں عملی شکل دے دی۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے مستشرقین کہتے ہیں کہ محمد ﷺ پیغمبر بننے کے زبردست خواہش مند تھے اور اس کے لیے وہ ایک طویل عرصے سے تیاری کر رہے تھے۔ ان کا عربوں کا قائد بننا بھی اسی خواہش کا حصہ تھا۔ یوں نئے دین کی بنیاد رکھنے کے لئے انھوں نے خدا اور وحی کا سہارا لیا۔ ان تمام اعتراضات میں نہ کوئی دم ہے اور نہ ہی کوئی حقیقت۔ مہر علی ان اعتراضات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> یہ مفروضے اور خیالات بالکل غلط اور بے بنیاد ہیں۔ ان کی بنیاد حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش

---

(۲۷) *Ibid.*, p. 40.

کرنے اور جن حالات میں نبیؐ کے اوپر وحی کا نزول ہوا ان کو غلط طریقے سے پیش کرنے پر ہے۔
یہ مفروضے غیر منطقی اور بے جوڑ ہیں۔[۲۸]

بیسویں صدی سے پہلے مستشرقین کا زیادہ زور اس بات پر ہوتا تھا کہ قرآن مجید ایک انسانی کاوش ہے نہ کہ یہ آسمان سے نازل کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی میں مستشرقین کا ایک نیا رجحان سامنے آیا جس میں دعویٰ کیا گیا کہ قرآن مجید کی ایک ارتقائی تاریخ ہے اور وہ زمانے کے مختلف مراحل میں مرتب ہوتا گیا۔ اس صدی میں ایسے مستشرقین سامنے آئے جو قرآن کے "مطالعۂ نو" پر زور دیتے تھے۔ ان میں جان وانزبرا، پیٹریشیا کرون، مائکل کوک اور یہودا دی نیو قابل ذکر ہیں۔ ان مستشرقین نے اس رجحان کے ذریعے سے قرآن مجید کے بارے میں مزید ابہام پیدا کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن نہ صرف انسانی ہاتھوں کی تخلیق ہے بلکہ یہ ارتقاء کے عمل سے وجود میں آیا ہے۔ ڈاکٹر مہر علی اس رجحان کے بارے میں کہتے ہیں:

بیسویں صدی کے ربع اخیر میں کچھ مستشرقین میں یہ رجحان ابھرا کہ قرآن نہ صرف انسانی تخلیق ہے بلکہ وہ ایک ارتقائی اور ترقی پذیر عمل کے تحت اسلام کی شروع کی دو صدیوں کے درمیان وجود میں آیا ہے۔ مستشرقین کے اس گروپ کو عموماً اصلاحی یا نظر ثانی کرنے والا revisionist کہا جاتا ہے[۲۹]

مستشرقین کے تراجم قرآن پر تنقید: ڈاکٹر محمد مہر علی نے سب سے پہلے مستشرقین کے تراجم قرآن کی تحریک کے مقاصد بیان کیے اور اس کے بعد ان کا جائزہ لیا۔ مستشرقین کے تراجمِ قرآن کی تحریک کے آغاز کے بارے میں ڈاکٹر مہر علی کا کہنا ہے کہ تراجم قرآن کی تحریک وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے تحریکِ استشراق کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مستشرقین کے ترجمۂ قرآن کا قصہ استشراق کی شروعات سے جڑا ہوا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جدید استشراق ترجمۂ قرآن سے ہی شروع ہوا۔ دوسری صلیبی جنگ شروع کرنے سے پہلے ہی عیسائی مفکرین کو یہ ادراک ہو گیا تھا کہ اسلام سے عقلی سطح پر مقابلہ کرنے کے لئے ایک

---

(۲۸) *Ibid.*, p. 94.

(۲۹) *Ibid.*, p. 2

"پرامن صلیبی جنگ" کا ہتھیار بنانا پڑے گا جیسا کہ فیلیپ حتّی نے کہا ہے۔(۳۰)

ڈاکٹر مہر علی نے مستشرقین کے قدیم تراجم پر سیر حاصل گفتگو کر کے ان کا بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے لوڈویکو مراکی Ludovico Maracci (م: ۱۷۰۰) اوراس کے پیروکاروں کے تراجم کی غلطیوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ انھوں نے جارج سیل George Sale (م: ۱۷۳۶) کے ترجمۂ قرآن کے پیچھے کارفرما مقاصد بھی بیان کیے ہیں۔ اس بدنام زمانہ ترجمۂ قرآن کو ڈاکٹر مہر علی نے آڑے ہاتھوں لیا ہے اور اس کی فاش غلطیوں کو طشت از بام کر کے دنیائے انسانیت کو اس کی خامیوں سے مطلع کیا ہے۔ مہر علی کا کہنا ہے کہ سیل نے ان غلطیوں کو دہرایا ہے جو مراکی نے کی تھیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ سیل نے مختلف اسالیب سے تحریف کی ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

- ترجمے میں عیسائی اصطلاحات کا استعمال۔
- اصل نص میں الفاظ یا عبارات دخل کرنا جن کی اصل سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔
- ترجمے میں ایسی تفاسیر و تعلیقات شامل کرنا جو غلط اور فاسد روایات پر مشتمل ہیں۔(۳۱)

اس کے بعد ڈاکٹر مہر علی نے انیسویں اور بیسویں صدی کے مشہور تراجمِ قرآن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جن میں روڈویل، پالمر، ریچرڈ بیل اور آربری کے ترجمے قابل ذکر ہیں۔ مہر علی نے ان چاروں تراجمِ قرآن پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے اور ان کی جملہ خامیوں کو واضح کیا ہے۔ مہر علی کے نزدیک ان تراجم کے ذریعے قرآن مجید کی تاریخ و تدوین، اس کی تعلیمات، زبان اور اصطلاحات اور اس کے اصل معنی و مفہوم کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر مہر علی نے ان غلطیوں کو واضح کیا اور ان کو انتہائی بچکانہ قرار دیا۔ ان کے علاوہ موصوف نے دوسرے مشہور یورپی تراجم کو بھی نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کا بھی تنقیدی جائزہ لیا۔(۳۲) مہر علی روڈویل کے ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں

---

(۳۰) یہ "پرامن" ہتھیار استشراق ہے۔ *Ibid.*, p. 334

(۳۱) ڈاکٹر محمد مہر علی، مستشرقین کے تراجم قرآن، ایک جائزہ ترجمہ: محمد جنید انور مشمولہ ماہنامہ تعمیر افکار کراچی پاکستان، جلد:۱۱، شمارہ:۹، ۱۰/ اگست-اکتوبر ۲۰۱۰، ص: ۶۲۹-۶۲۰۔

(۳۲) Muhammad Mohar Ali, *op cit.*, pp. 324-352.

کہ ”روڈویل سورتوں اور آیات قرآنیہ کی تاریخ کے بارے میں میور اور نولدکے کی آراء کے مابین تطبیق کرتا ہے۔ روڈویل کے ترجمے کو اصل کے ساتھ ملانا اور تقابل کرنا ایک مشکل کام ہے۔ روڈویل کا دعویٰ ہے کہ اس کا کام ایک علمی کوشش ہے جو ایک غیر معقول اور غیر حقیقی دعویٰ ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید کی بڑی سورتیں بیک وقت نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ ان کے مختلف اجزاء مختلف اوقات میں نازل ہوئے۔ ان مختلف اوقات کے حوالے سے کوئی اجماع نہیں ہے۔ ڈاکٹر مہر علی آربری کے ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کو مستشرقین یورپی زبانوں کے بہترین تراجم قرآن میں شمار کرتے ہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس ترجمے پر غور کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ بھی دوسرے تراجم سے مختلف نہیں ہے، خصوصاً تحریف، شکوک وشبہات اور ترجمے کے برائی کے پہلو سے۔مثلاً آربری لفظ فرقان کا ترجمہ Salvation یعنی نجات پانا سے کرتا ہے جو کہ غلط ہے اور وہ عیسائیت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔“ [۴۳]

ڈاکٹر مہر علی کا کہنا ہے کہ یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ مستشرقین کے تراجم قرآن مجید کا بغور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ یہ جائزہ ان کی جانب سے کیے جانے والے ہر سطح کے کام پر کیا جائے، نیز ان کی دیگر تحریروں و تصانیف میں قرآن مجید سے متعلق پائے جانے والے کام اور افکار کو بھی اس دوران نظر انداز نہ کیا جائے۔ الغرض ڈاکٹر مہر علی نے دینِ مبین کی صداقت اور دینی نصوص کی حقانیت کو مدلل و مفصل طور پر ثابت کیا۔ انھوں نے قرآنی دلائل، تاریخی حقائق اور عقل کی بنیاد پر اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری نازل کردہ کتاب ہے اور اس کے منزّل من اللہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اس کی تعلیمات اور اس کے احکام میں کوئی ٹیڑھ اور کجی نہیں ہے۔ نیز اس کی رہنمائی میں کوئی ابہام نہیں ہے اور یہ نوعِ انسانیت کے لیے دائمی ہدایت ہے۔ ڈاکٹر محمد مہر علی نے علمی و عقلی محاسن کے اثبات کی روشنی میں بھی قرآن مجید کی حقانیت، معقولیت اور افادیت پر مؤثر انداز اور اسلوب میں گفتگو کی ہے۔ [۴۴]

---

[۴۳] ڈاکٹر محمد مہر علی، مستشرقین کے تراجم قرآن ،ایک جائزہ ترجمہ: محمد جنید انور مشمولہ ماہنامہ تعمیر افکار کراچی پاکستان، جلد:۱۱، شمارہ: ۹، ۱۰ ، اگست۔اکتوبر ۲۰۱۰ء، ص، ۶۶۰۔

[۴۴] Muhammad Mohar Ali, *The Qur'an and the Orientalists: An Examination of their main theories and Assumptions*, 3.

رامپور رضا لائبریری میں مغلیہ عہد کے مشہور خطاطوں کی وصلیاں

ڈاکٹر تبسم صابر
رامپور رضا لائبریری اینڈ میوزیم
tabassumsabiralig@gmail.com

فنون لطیفہ کے شہ پارے اس دور اور ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جس میں وہ تشکیل دیے گئے۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ جملہ فنون لطیفہ میں فن خطاطی ممتاز و منفرد فن ہے۔ غور کریں تو بہت دلچسپی کے پہلو اس فن کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ انسان کے قلم کی جنبش تاریخ و تہذیب کے بہت سے رازوں کو سموئے ہوئے ہے۔ مسلم ثقافت کی بات کریں تو مسلمانوں نے ازل سے ہی اس فن میں خصوصی دل چسپی دکھائی۔ چونکہ اسلام میں تصویر کشی مطلقاً ممنوع ہے، لہٰذا مسلمانوں نے مصوّری کے بجائے خطاطی کو اپنی جمالیاتی حس کا مظہر بناکر پیش کیا اور قرآن پاک کی آیات کو لکھنے میں آرائش و جمال کے لاتعداد پہلو اجاگر کیے۔ یہاں تک کہ دنیا کی کسی قوم نے اپنے خط کے بارے میں اتنا اہتمام نہیں کیا جتنا مسلمانوں نے کیا ہے۔ ہر دور میں مسلم خطاطوں نے اس فن کی ترقی اور ترویج کے لیے کوششیں کیں اور اس فن کے نادر شہ پارے پیش کیے۔

ہندوستان میں فن خطاطی کو پروان چڑھانے والے مغل حکمراں ہیں۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ہر بادشاہ اس فن کی آبیاری کرتا نظر آتا ہے۔ ہر دور میں اس فن کے ماہرین کی عزت افزائی ہوئی۔ ان کے فن کے اعتراف میں انھیں یاقوت رقم، جواہر رقم، ہفت رقم، شیریں رقم، عنبریں قلم، زمرد قلم، مشکیں قلم وغیرہ جیسے خطابات سے نوازا جاتا رہا ہے۔ پوری مغلیہ سلطنت کی تاریخ کا مطالعہ کرتے جائیں تو ہر طرف فن خطاطی کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ ہمایوں، شیرازی کو خشخاش کے دانے پر "قل ھو اللہ" لکھنے پر زر و جواہرات میں تولتا نظر آتا ہے۔ اکبر نامور خطاطوں کو جاگیریں، منصب اور خطابات عطا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جہانگیر فن خطاطی پر طلائی مہر نچھاور کرتا ہوا اور شاہجہاں کسی یاقوت رقم کو طلائی سکوں میں تلواتا نظر آتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر منقش و مذہّب خطاطی پر لعل و جواہر نذر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ بابر خود ایک ماہر خطاط تھا، اس کا سلسلۂ شاگردی میر علی تبریزی سے ملتا ہے۔ وہ ترکی خوب لکھتا تھا اور اس نے خود ایک خط ایجاد کیا تھا جو خط بابری کے نام

سے موسوم ہوا۔ اس خط میں بابر نے قرآن مجید کا ایک نسخہ کتابت کرا کے مکۂ معظمہ بھیجا۔ دائرۃ المعارف میں دی گئی تفصیل کے مطابق قرآن مجید کا یہ نادر نسخہ کتاب خانۂ آستانۂ قدس رضوی، مشہد ایران میں ہے۔ اس کا کاغذ اور تذہیب کشمیری ہے، سورتوں کے عنوان طلائی رنگ کے اور آیات کے مابین فاصلے زرفشاں ہیں[۱]۔ رامپور رضا لائبریری میں بابر کا اپنا تر کی دیوان محفوظ ہے جس پر اس کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی رباعی اور شاہجہاں کی تصدیق ہے۔[۲]

ہمایوں جب ترک وطن کر کے ایران گیا تو وہاں خواجہ عبدالصمد "شیریں قلم" اور میر علی تبریزی کی ماہرانہ خطاطی سے اس درجہ متأثر ہوا کہ ہندوستان واپسی کے وقت انھیں اپنے ساتھ ہندوستان لے آیا۔ ہندوستان میں خطاطی کی روایات پہلے ہی قائم ہو چکی تھیں۔ ہمایوں کے ساتھ آنے والے ان خطاطوں نے شاہی سرپرستی میں بڑی آسودگی سے اعلی پیمانے پر کام کیا[۳]۔ ان ماہرین فن کی شاگردی اختیار کرنے کے لیے اور مغلیہ فرماں رواؤں کی سرپرستی کا شہرہ سن کر اندرون و بیرون ممالک کے بہت سے ماہرین فن سلطنت میں جمع ہو گئے۔

ہمایوں کے عہد کا ہی ایک اور نامور خطاط خواجہ سلطان تھا جسے اکبر نے اپنے عہد میں "افضل خاں" کا خطاب دیا تھا۔ پھر یہی خطاط اور دوسرے ماہرین کتابت اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے۔ اکبر نے فن خطاطی کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ خطاطوں کو جاگیریں، منصب اور خطابات دے کر نوازا اور دفتر انشاء میں مختلف عہدوں پر سرفراز بھی کیا۔ عہد اکبر کے اساتذہ خط نستعلیق میں محمد حسین کشمیری معروف بہ "زریں قلم" نے اکبر کے حکم پر آئین اکبری کا پورا نسخہ لکھا تھا جس میں مشہور مصوّروں نے تصویریں بنائی تھیں۔ اس نسخے پر تین لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے[۴]۔

عہد شاہجہانی میں روضہ تاج محل پر امانت خاں شیرازی نے جو آیات قرآنی خط ثلث میں تحریر کیں اور جو طغرے لکھے اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے مغل عہد کے خطاطوں نے صفحات قرطاس ہی کو پیرایۂ حسن نہیں دیا بلکہ ان کے فن کے جوہر مساجد کے دروازوں، اندرونی محرابوں،

---

[۱] مضمون فن خطاطی، دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۷۵ء، جلد ۱۵، ص ۹۷۶-۹۷۷

[۲] دیوان بابر،، تعارف سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی، رامپور رضا لائبریری ۲۰۱۴ء، ص ۴۵

[۳] مضمون فن خطاطی، دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۷۵ء، جلد ۱۵، ص ۹۷۷

[۴] ماخذ سابق، ص ۹۷۷؛ تحقیقات ماہر، دہلی ۱۹۳۴ء، ص ۱۳۷:۱

قرآن مجید کی جلدوں، مزاروں، ٹائلوں کی کاشی کاری، سنگ تراشی، قالینوں، سجادوں، ریشمی کپڑوں اور برتنوں پر بھی بکھرے پڑے ہیں۔

بابر کی نسل میں اول سے آخر تک نہ صرف شہزادے بلکہ شہزادیوں میں بھی فن خوشنویسی کا ذوق قائم رہا۔ ان کی لکھی ہوئی وصلیاں *سیکڑوں کی تعداد میں عجائب گھروں اور کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔خصوصاً گلبدن بانو، جہاں آرا، نور جہاں اور زیب النساء وغیرہ اسی طبقے میں داخل ہیں۔ رامپور رضا لائبریری میں تصوف کی بعض کتابوں پر جہاں آرا کی قیمتی تحریریں خوش خط لکھی ہوئی ہیں[۵] جس سے اس کے ذوق وشوق اور فن میں مہارت کی عکاسی ہوتی ہے۔

دارا شکوہ (۱۶۱۵- ۱۶۵۹ء) شاہجہاں کا لاڈلا بیٹا، سلطنت کا ولی عہد، عالم وفاضل، مفکر ومدبر، اہل نظر و اہل تدبر ہونے کے ساتھ نقاشی اور فن خوش نویسی میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ رامپور رضا لائبریری میں خط ثلث اور نسخ میں اس کے قلم سے حدیث نبوی کے نامکمل الفاظ تحریر ہیں حروف کے باہر کی زمین مطلا ہے اس پر نازک پھول پتوں کا دلفریب گلستاں پھیلا ہوا ہے۔ زمین زرافشاں ہے[۶]،اس کے علاوہ لائبریری میں "نفحات الانس" مکتوبہ ۹۱۸ھ / ۱۵۱۲ء کا ایک عمدہ نسخہ ہے جس کے ابتدائی صفحے پر داراشکوہ کے ہاتھ کی خوش خط تحریر ہے۔

اس کے علاوہ آخری تاجدار مغلیہ سلطنت بہادر شاہ ظفر فن خطاطی میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔انھوں نے مشہور خوشنویس جلال الدین حیدر مرصع رقم سے فن کو سیکھا تھا۔ ان کو خط نسخ، نستعلیق،خط طغریٰ اور خط نسخ معکوس میں مہارت تھی۔ ان کا ایک کتبہ بخط خط معکوس رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ جس میں یہ ترقیمہ ہے "کتبہ ابو ظفر بہادر"۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتبہ زمانۂ ولی عہدی کا ہے۔ زمانۂ شاہی کے تحریر کردہ کتبات پر وہ اپنا نام اس

---

* وصلی: دو باہم وصل کئے ہوئے کاغذ کا ورق جس پر خوشنویس قطعہ وغیرہ کی مشق کرتے ہیں، مشق کرنے کا موٹا کاغذ (ریختہ ڈکشنری)

[۵] دیکھیں مخطوطہ فارسی صد پند لقمان و رسالہ خواجہ عبد الانصاری کاتب میر علی (اس پر جہانگیر، شاہجہاں اور جہاں آرا کی تحریریں ہیں)۱۵۳۸ء، مخزونہ رامپور رضا لائبریری۔ یہ کل دس ورق کا رسالہ ہے۔شاہ جہاں نے اپنے قلم سے اس کی قیمت ایک ہزار روپے لکھی ہے اور اسے خاصۂ اول سے تعبیر کیا ہے۔رامپور کے نواب کلب علی خاں نے اس رسالے کو بنارس کے کسی شخص سے خرید کر داخل کتب خانہ کیا۔

[۶] پینٹنگ البم نمبر ۴ورق ۱۳ب، مخزونہ رامپور رضا لائبریری، رامپور، بحوالہ فہرست خطاطی مرتبہ ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی، مطبوعہ رامپور رضا لائبریری، رامپور ۲۰۱۵ء ص ۴۳

طرح لکھتے تھے "کتبہ محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ"(۷)۔

مغلیہ سلطنت کے صرف مشہور خطاطوں کے نام اگر ہم شمار کرنے لگ جائیں تو بھی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ جس سے یہاں بحث نہیں ہے۔ یہاں تو صرف ان شہ پاروں سے متعارف کرانا مقصود ہے جو مغلیہ سلطنت کے ابتدائی دور کے خطاطوں کے لکھے ہوئے ہیں اور رامپور رضالائبریری میں البموں اور جریدوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔

اگر ہم اس بات کو لے کر پریشان ہیں کہ دہلی، لکھنؤ اور ہندوستان کی دیگر ریاستوں کا وہ علمی وتہذیبی سرمایہ جو ۱۸۵۷ء کے غدر میں نیست ونابود ہو گیا تھا وہ کہاں گیا؟ تو ہمیں اس بات سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ رامپور رضالائبریری میں بہت حد تک یہ سرمایہ محفوظ ہے اور اس کا تمام تر سہرا نوابین رامپور کو جاتا ہے جنھوں نے ان ریاستوں سے لوٹے گئے سرمائے کو خرید کر ہماری تہذیب کو آنے والے وقتوں کے لیے محفوظ کر دیا۔

نوابین رامپور میں نواب محمد سعید خاں (۱۸۴۰ء-۱۸۵۵ء) کے عہد میں باقاعدہ فن خطاطی کا آغاز ہوا۔ انھوں نے میر عوض علی عدیل کو، جو حافظ نور اللہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، لکھنؤ سے اور غلام رسول اور محمد حسین کو کشمیر سے بلا کر ذات خاص میں ملازم رکھا اور بڑی قدردانی کی۔ میر عوض علی کی وجہ سے رامپور میں گھر گھر خوشنویسی کا ذوق پیدا ہوا۔ بڑی تعداد میں لائق شاگرد تیار کیے گئے۔ ان کے بعد نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں نے دیگر علوم وفنون کے ساتھ اس فن کے ماہرین کو اپنے دامن پرورش میں جگہ دی اور ان کے دور میں اس فن کو خوب ترقی ہوئی۔ ریاست کے آخر دور کے نواب، نواب حامد علی خاں بہادر اشکؔ (م:۱۹۳۰ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مغل عہد کے باکمال خطاطوں میر علی ہروی، میر عماد حسنی، آقا عبد الرشید دیلمی، سلطان علی مشہدی، محمد حسین کشمیری زریں قلم اور دوسرے ماہرین فن خط نستعلیق کے دلدادہ تھے، خطوط کی پرکھ اور اس کے امتیازات میں ماہرانہ نظر رکھتے تھے اور وصلیوں پر کاتب تحریر کا نام نہ ہونے کی صورت میں یہ فیصلہ کر دیا کرتے تھے کہ یہ تحریر فلاں خوش نویس کی ہے جو صحیح ثابت ہوتی تھی۔ ممبئی اور کلکتہ کے سفر کے دوران کتب خانے کے لیے مخطوطات کے علاوہ مشہور کاتبین کی نادر وصلیاں اور مغل مصوری کے اعلیٰ شاہکار خرید کر داخل کتب خانہ کرنا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

---

(۷) سید احمد رامپوری، فنان وخطاط، خط کی کہانی تصویروں کی زبانی: عربی خط کے عروج وزوال کی مختصر تاریخ، مطبوعہ رامپور رضالائبریری، رامپور ۲۰۰۴ء، حصہ دوم: ص۱۷۹۔

نواب محمد سعید خاں کے عہد سے لے کر نواب رضا علی خاں تک فن خوشنویسی و کتابت نے رام پور میں بے مثال ترقی کی اور ریاست کے تمام مشہور و معروف خطاط مثلاً غلام رسول کشمیری، محمد حسن کشمیری، میر عوض علی عدیل، مولوی الٰہی بخش، میر احمد حسن، مولوی مرتضیٰ ،صاحبزادہ محمد علی خاں ،غلام محی الدین ،امانت خاں ،مولوی حبیب احمد ،سید حسن رضا ،میاں جی عبد اللہ، مولوی عماد الدین خاں، حکیم مظہر احسن خاں، سید عزت علی، حافظ عظیم اللہ خاں، محمد علی خاں عرف دولہ خاں خوش رقم، شوکت علی خاں الماس رقم، اور سید عظمت علی معکوس نویس وغیرہ کی وصلیاں رضا لائبریری میں محفوظ ہیں[۸]۔

سوئے اتفاق رامپور رضا لائبریری میں محفوظ مشاہیر خوشنویسوں کے نادر و نایاب شہ پاروں کا کوئی کیٹلاگ تیار نہیں تھا۔ اس لیے یہ تمام شہ پارے پردۂ خفا میں تھے۔ لیکن اکتوبر ۲۰۱۵ء میں ان نایاب شہ پاروں کا ایک کیٹلاگ چھپ کر منظر عام پر آیا جس سے تحقیق کی نئی راہ ہموار ہوئی۔ رامپور رضا لائبریری میں خوشنویسان قدیم سلطان علی مشہدی ، میر علی ہروی، میر عمادالحسنی،محمد حسین کشمیری، آقا عبد الرشید دیلمی، عبد الباقی حداد اور دوسرے نامور خوشنویسان، جن کی تعداد چار سو سے زیادہ ہے، ڈھائی ہزار سے زیادہ نادر و نایاب وصلیاں ہیں جو کبھی شاہانِ مغلیہ کے کتب خانوں کی زینت تھیں[۹]۔ بہر حال زیر بحث عنوان کے تحت مغلیہ عہد کے مشہور خطاطوں میں پہلا نام عبد الباقی حداد المعروف بہ حاجی عبد اللہ الہروی کا ہے۔

عبد الباقی حداد المعروف بہ حاجی عبد اللہ الہروی: شاہجہاں نے انھیں اورنگ زیب کا استاد مقرر کیا تھا۔ خط نسخ میں ان کا ہاتھ بہت اچھا تھا۔ تیس ورقی ایک قرآن اور دوسرا قرآن چوب قلم (بخط جلی) لکھ کر شاہجہاں کو پیش کیا تھا جس پر شاہجہاں نے انھیں "یاقوت رقم" کا خطاب عطا کیا۔ حداد نے بہت سے نامور شاگرد تیار کیے جو یاقوت رقم اور یاقوت رقم ثانی کے خطابات سے سرفراز ہوئے[۱۰] ان کا قول ہے کہ "قلم کاتر چھا خط اور الفاظ کی بیضوی صورت خط نسخ کو بے حد کمال بخشتے ہیں"۔

---

[۸] فہرست خطاطی، مرتبہ ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی، رامپور رضا لائبریری، رامپور ۲۰۱۵ء۔

[۹] خط کی کہانی تصویروں کی زبانی۔ حصہ دوم: عربی خط کے عروج و زوال کی مختصر تاریخ، مؤلفہ سید احمد رامپوری فنان و خطاط، رامپور رضا لائبریری، رامپور ۲۰۰۴ء، ص: ج۔

[۱۰] علم الحروف یا تحقیقات ماہر حصہ دوم، ص ۱۴۲، مؤلفہ حکیم محمود علی خاں ماہر اکبر آبادی ثم دہلوی، سلسلۂ تصانیف ماہر نمبر ۲۰، مطبوعہ دہلی ۵، مارچ ۱۹۳۴ء۔

یاقوت رقم ایک قلم سے صرف ایک صفحہ تحریر کرتے تھے اور اس سلسلے میں آپ میر عماد الحسنی کے مقلد تھے۔ میر عماد کا کہنا تھا کہ "ایک صفحے کے بعد قلم کا خط اپنی جگہ چھوڑ دیتا ہے اور خط میں بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے"۔

یاقوت رقم کا قلم اور روشنائی بنانے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ آپ کے تحریر کردہ فن پاروں میں روشنائی کی چمک دمک اب تک موجود ہے اگرچہ وصلیاں اور کاغذ بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ روایات میں ہے کہ یاقوت رقم بالکل اسی معیار کی روشنائی تیار کرتے تھے جس طرح سے یاقوت مستعصمی تیار کیا کرتے تھے جو تحریر میں سہل اور سیکڑوں برس بعد بھی اپنی شان قائم رکھنے والی ہوتی تھی۔ اخیر عمر میں وہ ایران چلے گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔

یاقوت رقم نے اورنگ زیب عالمگیر کو ایک بڑی وصلی پر قرآن شریف لکھ کر پیش کیا تھا۔ اسے اورنگ زیب عالمگیر لاہور لے گئے اور اسے شاہی قلعے میں آویزاں کر دیا۔ اس وقت یہ نسخہ فقیر خانہ میوزیم بھاٹی گیٹ میں موجود ہے۔ اس میوزیم میں ان کے اور بھی شہ پارے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے تحریر کردہ ایک قرآن شریف کا نسخہ ٹونک کی سعیدیہ لائبریری میں بھی موجود ہے۔

رامپور رضالائبریری میں ان کی لکھی ہوئی بہت سی وصلیاں موجود ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

خطاطی البم نمبر ۱۵، ایس ٹی نمبر ۲۴۹۲، اکسیشن نمبر ۳۷۷۹ کے تحت نو وصلیاں مجلد ہیں۔ ان وصلیوں کا سائز ۱۵ ۲۱x۶ سینٹی میٹر ہے جبکہ مسطر کا سائز ۹.۵ x ۱۵ سینٹی میٹر ہے۔ عربی زبان میں احادیث مبارکہ رقم ہیں۔ یہ وصلیاں خط نسخ میں کشمیری نقش و نگار سے مزین ہیں۔ جلد پر بھی کشمیری نقش و نگار بنے ہیں۔ جلد کے دونوں کناروں کی پشت پر چڑیا کی شکل میں بسم اللہ الرحمان الرحیم لکھا ہے۔ وصلیوں کے شروع میں کاغذ کی ایک سلپ چسپاں ہے جس پر جریدہ احادیث متعدد قلمی ۹ وصلیاں خوش خط کے بعد آغا غلام رسول لکھا ہے۔ جس سے یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آغا غلام رسول اس کے لکھنے والے ہیں۔ لیکن اند تحریر سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ عبد الرشید حداد الہروی کی بنائی ہوئی وصلیاں ہیں۔ میدان کتابت کے چاروں اطراف پر طلائی، سیاہ، سبز اور نیلے رنگوں سے جدولوں کے حصار کشیدہ ہیں۔ بین السطور میں تذہیب کاری کی گئی ہے۔ جہاں پر کتاب ختم ہوئی ہے وہاں سنہری روشنائی سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ نقش و نگار میں وہی حسن نظر آتا ہے جو دبستان ہرات کی خصوصیت ہے۔

ان وصلیوں کی دوسری کاپی خطاطی البم نمبر ۷، ایس ٹی نمبر ۲۵۰۵، اکسیشن نمبر ۳۷۷۱ کے

تحت ہے۔ اس کا زمانہ ۱۶۵۸ء کا ہے۔ اس البم کی وصلیوں میں صرف تزئین کاری کا فرق ہے، باقی تفصیلات یکساں ہیں۔ اس البم کے شروع میں دو نوٹ چسپاں ہیں۔ پہلا نوٹ آقا محمد محسن نیشاپوری کا ہے کہ ''گزرانیدہ بندۂ عاصی آقا محمد محسن نیشاپوری''، دوسرا نوٹ محمد علی خطاط کا نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے کہ اگر اس زمانے میں آفتاب کی مشعل لے کر بھی تلاش کیا جائے تو بھی یقین نہیں ہے کہ اس جیسی دوسری تحریر ہاتھ آئے۔

اس کے علاوہ خطاطی البم نمبر ۳۸، ایس ٹی نمبر ۲۵۱۹، اکسیشن نمبر ۱۴ کے تحت دو وصلیاں ہیں۔ وصلی کا سائز ۵۔۸x۴۔۳۵ سینٹی میٹر اور مسطر کا سائز ۵۔۱۲x ۵۔۱۷ سینٹی میٹر ہے۔ وصلیوں کا میدان کتابت کتھئی رنگ کا ہے۔ خط نسخ اور خط ثلث میں لکھی گئی ہیں۔ صفحے کی پیشانی اور درمیان میں سفید خفی جدولوں کا حصار کشیدہ ہے۔ خط ثلث جلی اوسط قلم اور سیاہ روشنائی کا استعمال کیا ہے۔ عبارت دکنی زبان میں کتاب ''نورس'' کی نقل ہے۔ میدان کتابت کے چاروں طرف آسمانی، سفید اور انگوری رنگوں کے حاشیے ہیں جن پر سنہری روشنائی سے باریک بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ حاشیے کے گرد سفید اور سیاہ روشنائی سے حصار کھینچا گیا ہے۔

خطاطی البم نمبر ۴۰، ایس ٹی نمبر ۲۵۲۳ کے تحت ۴۰ وصلیاں ہیں۔ تمام وصلیوں کا سائز ۴۲x۳۰ سینٹی میٹر ہے۔ یہ سب خط نسخ اور ثلث میں ہیں۔ وصلیوں کی زمین بادامی، آسمانی، زعفرانی رنگ کی ہیں۔ ایک وصلی پر پیشانی کی عبارت کے نیچے خفی نسخ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک قول نقل ہے۔ ہر عبارت کے گرد طلائی، سیاہ اور زنگاری جدولوں کا حصار بنا ہوا ہے۔ خطاط نے سیاہ روشنائی کا استعمال کیا ہے۔ بیرونی حاشیے سبز رنگ اور افشاں ہیں۔

خطاطی البم نمبر ۴۱، ایس ٹی نمبر ۲۵۲۴ کے تحت ۳۰ وصلیاں ہیں جن کا سائز ۴۶x۳۲ سینٹی میٹر ہے۔ نسخ یاقوتی میں تمام وصلیاں بہت خوبصورت لکھی ہوئی ہیں۔ آخر الذکر دونوں البم کی وصلیوں پر خطاط کا نام عبد اللہ لکھا ہے جس نام سے وہ مشہور تھے۔ باقی ماقبل تین البم کی وصلیوں میں عبدالباقی حداد رقم ہے۔

آقا عبد الرشید دیلمی (ف ۱۰۸۱ھ یا ۱۰۸۵ھ یعنی ۱۶۷۰ء یا ۱۶۷۴ء): جہانگیر کے عہد کے مشہور خطاطوں میں سے تھے۔ یہ میر عماد حسنی قزوینی کے شاگرد، بھتیجے اور داماد تھے۔ عام خوشنویسوں کے نزدیک ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خط نستعلیق کا آغاز خواجہ میر علی تبریزی سے ہوا اور خاتمہ عبد الرشید پر۔ سید احمد رامپوری فنان نے اپنی کتاب مرقع خوشنویسان مختصر تذکرۂ خطاطانِ ہندوایران ص۳۶ پر ان کے بارے میں لکھا ہے کہ

''میر علی تبریزی، میر عماد اور آقا عبد الرشید کی وصلیوں اور ان کی تحریروں میں امتیاز کرنا صرف ماہر فن کا کام ہے''۔[11]

وہ شاہ جہاں کی حکومت کے آغاز میں ہندوستان آئے۔ لاہور ہوتے ہوئے تباہی اور خستہ حالی میں آگرہ پہنچے۔ ان کی آمد پر شاہجہاں نے اظہارِ خوشنودی کیا اور انتہائی احترام کے ساتھ اپنا درباری خوشنویس اور شہزادہ داراشکوہ کا استاد مقرر کیا نیز پندرہ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا اور حکم دیا کہ خط نستعلیق کو ہندوستان میں عام رواج دینا چاہیے۔ شاہجہاں نے انھیں خدمت اتالیقی کے علاوہ خدمت بیوتات (سرکاری عمارتوں اور سڑکوں کی دیکھ بھالی کی ذمہ داری) پر سرفراز کر دیا تھا۔ آگرہ میں انھوں نے شاندار عمارتیں اور مسافر خانے تعمیر کرائے۔

ان کا مرتبہ کتابت میں بہت بلند ہے۔ ائمۂ فن ان کو خطاطی کا پیغمبر سمجھتے ہیں۔ جہاں آرا نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ ان کی وصلیاں ان کی زندگی میں جواہر کے مول فروخت ہوتی تھیں۔ بڑھاپے تک مشق جاری رہی۔ ان کا ۱۰۸۱ھ یا ۱۰۸۵ میں آگرہ میں عہد عالمگیر کے دوران انتقال ہوا۔ ان کے شاگردوں میں شاہزادہ داراشکوہ، محمد اشرف خواجہ سرا، سعیدی اشرف، میر عبد الرحمان ہروی اور میر حاجی مشہور ہیں۔

رامپور رضا لائبریری میں ان کے ہاتھ کے کتابت کیے ہوئے کئی نسخے ہیں جن میں ''گلستان سعدی'' کا ایک اہم نسخہ ہے جسے انھوں نے ۱۰۸۱ھ / ۱۶۷۰- ۱۶۷۱ء میں خوش خط تحریر کیا تھا۔ یہ نسخہ میر عماد کے قلمی نسخے کی نقل ہے جو خود مصنف کے نسخے سے منسوب ہے۔ ''دیوان ہلالی چغتائی'' مکتوبہ ۹۹۴ھ / ۱۵۸۶-۱۵۸۵ء کا ایک اہم اور نادر نسخہ ہے جس پر عبد اللہ چلپی کے دستخط اور اعتماد خان، عنایت خاں اور صادق خاں کے ساتھ عبد الرشید دیلمی کی مہریں اور عرض دیدے موجود ہیں۔ لال قلعے کے دیوان خاص کے کونے کی محرابوں کی مستطیل تختیوں پر سعد اللہ خاں کا یہ شعر انھیں کا کتابت کیا ہوا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

رامپور رضا لائبریری میں ان کے ہاتھ کی بہت سی وصلیاں ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

---

[11] سید احمد رامپوری فنان و خطاط، مرقع خوش نویسان مختصر تذکرۂ خطاطانِ ہند و ایران، رامپور رضا لائبریری، رامپور ۲۰۰۷ء۔

خطاطی البم نمبر ۶۷، ایس ٹی نمبر ۲۵۵۶، اکسیشن نمبر ۵۱ کے تحت ۱۸ وصلیاں مجلد ہیں جو مختلف خوشنویسوں کی لکھی ہوئی ہیں بعض وصلیوں پر خطاط کا نام رقم نہیں ہے۔ اور ایک دو وصلیوں پر سے نام مٹا دیے گئے ہیں۔ البتہ وصلی نمبر ۱۰،۸،۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۸ پر عبد الرشید دیلمی کا نام مع سنہ کتابت واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔ یہ تمام وصلیاں مختلف سائز کی ہیں اور جس البم میں یہ شامل ہیں اس کا سائز ۳۲x۲۷ سینٹی میٹر ہے۔ خط نستعلیق میں نہایت خوش خط لکھی ہوئی ہیں۔ کتابت کی زمین کچھ وصلیوں کی مٹیالی، کچھ کی کتھئی، کچھ کی اخروٹی اور کچھ کی بادامی رنگ کی ہے۔ پہلی وصلی کی محراب پر طلائی، فیروزی، نیلے، سرخ، نارنج اور سیاہ رنگوں سے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ خط نستعلیق میں ۱۱ سطروں میں فارسی زبان میں ایک عرضداشت لکھی ہے۔ پیشانی پر اللہ اکبر، الٰہی خلیفہ الرحمانی صاحبقرانِ ثانی لکھا ہے اور اس کے نیچے عرضداشت بندۂ فدوی عبد الرشید دیلمی رقم ہے۔

خطاطی متفرق پینٹنگ البم نمبر ۳ ورق ۱۹ پر عربی میں ایک وصلی ہے۔ اس وصلی کا سائز ۳۲.۵ x ۲۱.۳ سینٹی میٹر ہے۔ خط نستعلیق میں دعاناد علی تحریر ہے۔ وصلی کے اطراف شنگرفی، طلائی اور لاجوردی رنگوں اور تعلیدی اشکال سے مزین ہیں۔

میر عماد الحسینی سیفی قزوینی (ف ۱۰۲۴ھ / ۱۶۱۵ء) ایرانی الاصل تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے خط نستعلیق کے ہنر زیبا کو سرحد اعجاز پر پہنچا دیا۔ ان کی خطاطی کے سامنے بہت سے مشہور خطاطوں کا فن ماند پڑ گیا۔ وہ جلی اور خفی خطوں میں بہت عمدہ لکھنے والے تھے۔ ان کا اسلوب خط اور ان کی شہرت اس درجے پر پہنچی کہ ان کا فن شعراء کے لیے موضوع شعر ہو گیا اور متعدد قطعات ان کی تعریف میں لکھے گئے۔

ان کے تلامذہ کے ذریعے نستعلیق دنیا کے مختلف گوشوں میں مقبول ہوا۔ ان کا شہرہ بہ حیثیت اعلیٰ خوش نویس اپنے زمانے میں بھی دوسرے ممالک کے اطراف تک گونج رہا تھا۔ ان کے لکھے ہوئے قطعات ایران، توران، ترکی اور ہندوستان میں گراں قیمت پر خریدے جاتے اور شاہان وقت فخریہ ان کو اپنے محلات اور کتاب خانوں کی زینت بناتے تھے۔ میر عماد نے استاد عیسی رنگ کارؔ، مالک دیلمی، ملا حسین تبریزی سے خط کی اصلاح لی تھی۔ بابا شاہ اصفہان، میر علی اور سلطان علی مشہدی کی وصلیوں سے بھی استفادے کا ذکر ملتا ہے۔[۱۲]

---

[۱۲] تحقیقات ماہر، ص ۱۰۵-۱۰۶، مرقع خوش نویسان، ص ۳۲۱۔

اصفہان میں درویشانہ وضع سے رہا کرتے تھے۔ شاہ عباس قلی نقوی کے دربار میں ملازم تھے۔ شاہ کے حکم سے شاہ نامہ فردوسی لکھنا شروع کیا تھا۔ ستر اشعار لکھ کر شاہ کی خدمت میں پیش کیے جس کا صلہ شاہ نے ستر تومان (ایرانی سکہ) دیا۔ اس انعام کو میر صاحب نے خلاف شان سمجھ کر واپس کر دیا۔ اس شان بے نیازی سے شاہ عباس ناراض ہو گیا اور یہ ناراضی یہاں تک بڑھی کہ انہیں قتل کرا دیا گیا۔ جہانگیر کو جب ان کے قتل کا پتا ہوا تو بہت رویا اور کہا کہ اگر شاہ عباس میر عماد کو میرے پاس بھیج دیتا تو میں ان کے ہم وزن موتی دیتا۔

تحقیقات ماہر کے حاشیے میں اس قتل کی تفصیلات یہ لکھی ہیں: شاہ عباس نے خط نستعلیق میں شاہ نامہ فردوسی کی نقل کے لیے حکم دیا۔ میر عماد نے خواہش کی کہ مجھے ایک آراستہ باغ میں بیٹھ کر لکھنے کا انتظام کر دیں اور اس باغ کے حوض میں عرق گلاب اور عرق کیوڑہ بھروا دیا جائے۔ شاہ نے باغ کی آراستگی کا حکم دے دیا۔ میر عماد تین سال تک اس باغ میں بیٹھ کر شاہ نامہ کی نقل کرتے رہے۔ اس عرصے میں باغ کی آراستگی پر چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ جب بادشاہ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میر صاحب نے شاہ نامہ کے صرف چھ جز نقل کیے ہیں۔ بادشاہ غضبناک ہوا اور میر صاحب کو حکم دیا کہ ایک روز میں چھ لاکھ روپیہ خزانہ شاہی میں داخل کر دو۔ میر صاحب نے اصفہان کے باشندوں کی مدد سے آدھے دن میں چھ لاکھ روپیہ خزانہ شاہی میں داخل کر دیا۔ مگر بادشاہ کے غصے کے بھڑکانے کے لیے اس واقعہ نے تیل کا کام دیا اور میر صاحب کو قتل کر دیا گیا[۱۳]۔

خطاطی البم نمبر ۶۷، ایس ٹی نمبر ۲۵۵۶، اکسیشن نمبر ۵۱ کے تحت ان کی پانچ وصلیاں ہیں۔ ان وصلیوں کے نمبر ۴، ۵، ۶، ۷، اور ۱۲ ہیں۔ وصلیوں کا سائز متفرق ہے۔ جس البم میں یہ شامل ہیں اس کا سائز ۳۲x۲۷ سینٹی میٹر ہے۔ پہلی وصلی نمبر ۴ میں فارسی میں خط نستعلیق میں قطعہ رقم ہے۔ یہ وصلی ۱۰۲۲ھ / ۱۶۱۳ء کی ہے۔ میدان کتابت بادامی رنگ کا ہے جس پر سنہری روشنائی سے گل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ میدان کتابت کے اطراف میں سنہرے اور ہلکے انگوری رنگوں کے حاشیے ہیں۔ اطراف میں طلائی، سیاہ، سرخ، سبز اور نیلے رنگوں کے جدول ہیں۔ دوسری وصلی نمبر ۵ کتھئی رنگ کے کاغذ پر خط نستعلیق میں فارسی میں قطعہ رقم ہے۔ یہ وصلی ۱۰۰۷ھ / ۱۵۹۸ء کی ہے۔ میدان کتابت کے گرد طلائی، نارنجی، سبز اور نیلے رنگوں سے حصار کشیدہ ہیں۔ میدان کتابت کی

---

[۱۳] تحقیقات ماہر، ص ۱۰۶۔

زمین پر بھی تذہیب کاری کی گئی ہے۔ تیسری وصلی نمبر ۶ میں بادامی کاغذ پر فارسی میں شعر رقم ہے۔ یہ شعر ان کا اپنا لکھا ہوا ہے اور ان کے تذکرے میں ملتا ہے:

ز مخلوق کارت کشایش نیابد
دل اندر خدا بندا گر کار خواہی

اس وصلی کی زمین پر سنہری اور کالی سیاہی سے باریک بوٹے ہیں۔ اطراف میں حاشیہ انگوری رنگ میں ہے۔ حاشیہ کے اندر و باہر اطراف میں نارنجی، طلائی، سیاہ اور نیلے رنگوں سے جدول بنے ہیں۔

چوتھی وصلی نمبر ۷ پر سنہ دھندلا ہو گیا ہے۔ اس وصلی میں خط نستعلیق میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مناجات میں عربی کا یہ شعر رقم ہے:

وکلهم یرجو نوالک راجیا
لرحمتک العظمی فی الخلد یطمع

وصلی میں کلهم یرجو کی جگہ کلهم نرجوا اور فی الخلد یطمع میں یطمع سے قبل الف زائد ہے۔

عبارت کے اطراف میں آسمانی رنگ کا حاشیہ ہے۔ حاشیے کے اندر باہر گہرے سبز، طلائی، سیاہ اور نیلے رنگ کے جدول ہیں۔ وصلی نمبر ۱۲ پر سنہ درج نہیں ہے۔ اس میں نیلی زمین پر زعفرانی رنگ سے فارسی قطعہ لکھا ہے۔ میدان کتابت کی حصار بندی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی کوئی تزئین و تذہیب ہے۔

خطاطی متفرق پینٹنگ البم نمبر ۳ ورق ۲۴ب پر فارسی میں ایک وصلی ہے۔ یہ خط نستعلیق میں لکھی گئی ہے۔ میدان کتابت کے چاروں اطراف خوبصورت نقش و نگار اور اشکال بہائم سے تزئین کی گئی ہے۔

میر عبداللہ مشکیں قلم: جہانگیر کے عہد کے مشہور خطاط تھے اور شہزادہ سلیم کی ملازمت میں تھے۔ ان کا ایک کتبہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے کیونکہ شہزادہ سلیم کی بغاوت کے زمانے (۱۰۱۱ھ /۱۶۰۳-۱۶۰۲ء) کا ہے جب شہزادہ سلیم نے آزاد حکومت کا اعلان کر دیا تھا اور وہ الہ آباد میں مقیم تھا۔ اس کتبہ میں وہ خود کو عبد اللہ سلیم شاہی لکھتا ہے۔ یہ نادر وصلی بھی رامپور رضالائبریری میں محفوظ ہے۔

خطاطی متفرق پینٹنگ البم نمبر ۳ ورق ۶ ب پر ایک وصلی ہے۔ اس کا سائز ۵۔۱۶x۵۔ ۲۷ سینٹی میٹر ہے۔ اس وصلی میں زعفرانی زمین پر مرکب سیاہ سے فارسی میں قطعہ تحریر ہے۔ چوطرفہ سبز کا حاشیہ ہے جس پر طلائی نقوش ہیں اور اطراف پر شنگرفی جدول کشیدہ ہیں۔

محمد حسین کشمیری زرّیں قلم (۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء): نستعلیق کے باکمال استاد تھے۔ اکبر نے ان کو "زریں قلم" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ لیکن ابوالفضل نے ان کو "جادو رقم" لکھا ہے۔ مدات و دوائر میں اپنے استاذ مولانا عبد العزیز سے بڑھ گئے تھے اور میر علی کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے۔ ابوالفضل نے عہد اکبر کے اساتذۂ خط کا ذکر کرتے ہوئے ان کے متعلق لکھا ہے کہ :

> خطاب زریں قلم سے روشناس آفاق ہے۔ مولانا عبد العزیز کا شاگرد ہے لیکن وہ اس فن میں اپنے استاد سے بھی سبقت لے گیا؛ اس کی مدّیں اور دائرے بہت مناسب ہیں[۱۴]۔

انھوں نے اکبر کے حکم سے آئین اکبری کا پورا نسخہ کتابت کیا تھا اور اس میں مشہور مصوّروں نے تصویریں بنائی تھیں۔ اس نسخے کی تیاری پر تین لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ یہ نسخہ اجین میں تھا، بعد میں دس ہزار روپیہ میں فروخت ہو کر لندن چلا گیا۔ ابوالفضل نے مرقع اکبری کا ذکر اپنے سہ دفتر میں کیا ہے کہ اسے دراصل شہزادہ سلیم کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس مرقع میں مشاہیر خطاطین کے نمونے یکجا کر دیے تھے اور ان پر محققانہ بحث کی گئی تھی۔ مرقع کے آخر میں مشاہیر نستعلیق نویساں کا بھی ذکر کیا ہے[۱۵]۔

خطاطی متفرق پینٹنگ البم نمبر ۴ ورق ۲۸ب، ۲۹ب اور ۳۰ب پر تین وصلیاں ہیں۔ ان کا سائز ۵۔۲۹x۴۳ سینٹی میٹر ہے۔ پہلی وصلی میں خط نستعلیق میں کتھئی زمین پر مرکب سیاہ سے ایک فارسی قطعہ تحریر ہے۔ میدان کتابت کے گرد سفید اور سیاہ جدولوں کا حصار ہے۔ دوسری وصلی میں سفید زمین پر خط نستعلیق میں فارسی قطعہ تحریر ہے۔ اطراف میں کتھئی حاشیہ سفید جدولوں اور زرافشاں بادامی حاشیے سے مزین ہے۔ تیسری وصلی میں بادامی زمین پر مرکب سیاہ سے نستعلیق میں تین فارسی اشعار تحریر ہیں۔ اطراف میں مثلث گوشے ہیں جو لاجوردی، طلائی اور شنگرفی نقش و نگار سے مزین ہیں اور ان کے اطراف میں طلائی اور سیاہ جدولوں کا حصار کشیدہ ہے۔

رامپور رضا لائبریری میں خطاطی البم نمبر ۴۹، اکسیشن نمبر ۲۵۲۷، ایس ٹی نمبر ۳۲ کے تحت مختلف خوش نویسوں کی ۲۳ وصلیاں مجلد ہیں۔ ان میں ۱۴ نمبر وصلی ہے جس پر خطاط کا نام محمد حسین الکشمیری رقم ہے۔ اس پر تین فارسی شعر لکھے ہیں۔ اس وصلی کا میدان کتابت گہرے بادامی رنگ

---

[۱۴] آئین اکبری ۱۱۵/۱، دائرہ معارف اسلامیہ، ص ۹۷۷۔

[۱۵] تحقیقات ماہر ص ۱۳۷؛ مرقع خوش نویساں، ص ۲۳۳۔

کا ہے، زر افشانی ہے، اطراف میں ہلکے کاسنی رنگ کا حاشیہ ہے جس پر سیاہ، طلائی، نیلے اور سبز رنگ کے جدول ہیں۔

حاجی محمد حسین الکاتب: خاندانی تعلق آذر بائیجان سے تھا۔ تبریز میں پیدا ہوئے تھے۔ مصطفی عالی افندی نے "مناقب ہنروران" میں آپ کے بارے میں لکھا ہے کہ "آپ کو قدرت تحریر، وقوف قلم اور مختلف علوم میں ید طولی حاصل تھا"(۱۶)۔ آپ کے دو شاگردوں کو فن خوش نویسی میں بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ایک میر عماد حسنی قزوینی، اور دوسرے علی رضا عباسی تبریزی۔ لوگ تعلیم کتابت کی غرض سے دور دراز علاقوں سے سفر کرکے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے آتے تھے۔ تبریز کی اکثر عمارات کے کتبات آپ نے لکھے تھے۔ استنبول کے میوزیم میں آپ کے خط کے نمونے محفوظ ہیں(۱۷)۔

رامپور رضا لائبریری میں خطاطی البم نمبر ۴۹، اکسیشن نمبر ۲۵۲۷، ایس ٹی نمبر ۳۲ کے تحت مختلف خوش نویسوں کی ۲۳ وصلیاں مجلد ہیں ان میں وصلیاں نمبر ۱۰، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۹ ان کی لکھی ہوئی ہیں۔ تین وصلیوں میں گہرے بادامی رنگ کے کاغذ پر فارسی میں اشعار رقم ہیں۔ میدان کتابت زر افشاں ہے اور اس پر چھوٹی چھوٹی مختلف اقسام کی رنگ برنگی چڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ دو طرف کونوں میں طلائی، سفید اور ہلکے گلابی رنگوں سے بیل بوٹے بنے ہیں اور اسماء حسنیٰ لکھے ہیں۔ حاشیے کی زمین سفید اور سادہ ہے۔ میدان کتابت کے اطراف میں اور حاشیے کے اطراف میں نیلی، سیاہ، طلائی اور سبز رنگ کے جدول ہیں۔ البتہ چوتھی وصلی نمبر ۱۳ قدرے مختلف انداز کی ہے۔ اس کا میدان کتابت ہلکے بادامی رنگ کا ہے اور جہاں جہاں عبارت لکھی ہے اس کو چھوڑ کر باقی پوری زمین سنہرے رنگ کی ہے جس پر مختلف رنگوں کے خوبصورت نقش و نگار بنے ہیں۔ اس وصلی میں خط بھی زیادہ روشن سیاہی سے نمایاں، صاف اور دلکش لکھا ہوا ہے، اطراف میں نیلے، سنہرے اور ہلکے انگوری رنگ کے حاشیے ہیں جن پر طلائی، سفید جلی و خفی، سیاہ، نیلے اور سبز رنگ کے جدول ہیں۔

میر عبداللہ الحسنی: میر علی تبریزی کے فرزند تھے۔ خط کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی۔ ان کے لکھے ہوئے اکثر کارنامے محفوظ ہیں(۱۸)۔ وہ جہانگیر کے عہد میں ایران سے تشریف لائے تھے

---

(۱۶) بحوالہ مرقع خوش نویسان، ص ۲۲۸۔

(۱۷) مرقع خوش نویساں ص ۲۲۸۔

(۱۸) مرقع خوش نویساں، ص ۱۷۶۔

اور مشہور خوش نویسوں میں سے تھے۔ لاہور میں ان کے خط کے نمونے ملتے ہیں۔ خفی کتابت کے نمونے کتاب خانہ ملی تہران میں محفوظ ہیں۔ رامپور رضا لائبریری میں ان کی وصلیاں موجود ہیں۔

خطاطی البم نمبر ۴۹، اکسیشن نمبر ۲۵۲۷، ایس ٹی نمبر ۳۲ کے تحت مختلف خوش نویسوں کی ۲۳ وصلیاں مجلد ہیں ان میں وصلی نمبر ۱۵ اور ۱۷ ان کی لکھی ہوئی ہے۔ پہلی وصلی نمبر ۱۵ چھوٹے سائز ۹x۵۔۱۳ سینٹی میٹر ہے جس میں مسطر کا سائز اور بھی کم ہے اس پر فارسی میں ایک رباعی رقم ہے۔ میدان کتابت زر افشاں ہے اردگرد گلابی حاشیہ ہے جس کے اطراف میں طلائی، سبز، سیاہ اور نیلے رنگوں کا حصار ہے۔

۱۷ نمبر وصلی پر بھی خط نستعلیق میں ایک فارسی رباعی رقم ہے۔ یہ درمیانے سائز کی وصلی ہے۔ اس کا میدان کتابت مٹمیلے رنگ کا ہے جس پر کتابت کی جگہ چھوڑ کر باقی جگہ سنہری روشنائی سے نقش و نگار بنے ہیں۔ اس کے اطراف میں گلابی رنگ کا حاشیہ ہے۔ حاشیے کے اندر اور باہر طلائی، سیاہ، نیلے اور ہرے رنگوں کے جدول ہیں۔

ملا عبداللہ تبریزی مشکیں قلم (۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء): شیخ فیض اللہ سہارنپوری کے مرید اور شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد میں سے تھے۔ علوم ظاہری اور کثرت اسباب کے ساتھ کمالات باطنی سے موصوف اور خط نستعلیق کے بااصول اور اعلی خوش نویس تھے۔ اکبری اور جہانگیری عہد میں ملازمت شاہی میں داخل رہے۔ مشکیں قلم کا خطاب اکبر نے دیا تھا۔ یہ ہفت قلم تھے اور خط نستعلیق کے بااصول اور اعلیٰ خوشنویس تھے۔ شاعری میں وصفی تخلص کرتے تھے۔ آگرہ میں انتقال ہوا۔ یک دیوان بہ عہد اکبر (۱۰۱۱ھ / ۱۶۰۲ء) کتابت کیا تھا۔ عہد جہانگیر کے اکثر کتبہ جات مثلاً کتبہ مزار شاہ بیگم واقع خسرو باغ الہ آباد اور کتبہ لال قلعہ الہ آباد ان کی یادگار ہیں۔[19]

خطاطی البم نمبر ۴۹، اکسیشن نمبر ۲۵۲۷، ایس ٹی نمبر ۳۲ کے تحت مختلف خوش نویسوں کی ۲۳ وصلیاں ہیں ان میں ایک وصلی پر خطاط کا نام واضح نہیں ہے صرف مشکیں قلم پڑھنے میں آسکا۔

اپنے موضوع کو محدود رکھتے ہوئے میں یہاں صرف انھیں چند خطاطوں کی وصلیوں کے تعارف پر اکتفا کیا ہے جو اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ اکبر سے پہلے اور شاہجہاں کے عہد کے بعد کے بھی بہت سے مشہور خطاطوں کی وصلیاں رامپور رضا لائبریری میں موجود ہیں، جن پر کام کرنے کی گنجائش ہے۔

---

[19] تحقیقات ماہر، ص ۱۳۹؛ مرقع خوش نویساں، ص ۱۶۹-۳۰۹۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا نظریۂ ارتفاقات
جدید ارتقائی نظریات کی روشنی میں

محمود الریاض
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامیات، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
mirmehmoodriyaz@gmail.com

اٹھارویں صدی عیسوی کی عبقری شخصیت شاہ ولی اللہ دہلوی نے تقریباً تمام اسلامی موضوعات پر ایک ماہر فن کی حیثیت سے قلم اٹھایا۔ قرآن و حدیث، فقہ و اجتہاد، تصوف و سلوک، ان سارے موضوعات پر ان کی تصانیف سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسرار شریعت کا فہم ان کے قلم کا خاصہ ہے۔ شاہ صاحب نے انسانی سماج کے تعلق سے بھی ایک ماہر فن کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے۔ انسانی سماج کا مطالعہ جسے ہم آج عمرانیات (Sociology) سے موسوم کرتے ہیں، اس کے تعلق سے شاہ صاحب کے قلم سے قیمتی مواد سامنے آیا ہے جسے نظریۂ ارتفاقات کے نام جانا جاتا ہے۔ یہاں ہم نے اسی نظریۂ ارتفاقات کا جدید نظریات کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

شاہ صاحب کا نظریۂ ارتفاقات: شاہ صاحب کے "نظریۂ ارتفاقات" سے مراد ان کا سماج کے تعلق سے وہ نظریہ ہے جس کے مطابق سماج ایک ارتقائی عمل کے ذریعے مختلف مراحل طے کر کے متمدن دور میں داخل ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے نظریۂ ارتفاقات کے مطابق یہ چار ارتقائی مراحل ہیں جن سے گزر کر انسانی سماج نے اپنی موجودہ منزل تک سفر طے کیا ہے۔ شاہ صاحب ان مراحل کو ارتفاق اول، ارتفاق دوم، ارتفاق سوم اور ارتفاق چہارم سے موسوم کرتے ہیں۔ اپنے اس نظریے میں شاہ صاحب نے سماج کے تعلق سے اپنے عہد تک کے جدید تجرباتی علوم سے استفادہ کیا ہے جس کی وجہ سے سماج کے تعلق سے اس بحث کا دائرہ اسلامی حلقوں سے لے کر عمرانیات کے جدید ماہرین تک وسیع ہو گیا۔ شاہ صاحب کی نظر میں سماج کے ارتقاء کے چار مراحل مندرجہ ذیل ہیں:

ارتفاق اول: اس مرحلے میں ان کے نزدیک زمین کے کسی بھی حصے میں، پہاڑوں میں، صحراؤں میں، دور یا قریب کی کسی بھی جگہ جہاں انسان موجود ہوں سماج کی بنیاد پڑتی ہے۔ اس مرحلے میں زندگی کی

بنیادی ضروریات جیسے روزی روٹی کا حصول، رہنے کے لئے گھر اور جنسی حاجت کے لئے زوج کی ضرورت وغیرہ سے سماج کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔

ارتفاق دوم: ارتفاق کا دوسرا مرحلہ پہلے ہی مرحلہ کی ترقی کا نام ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک اس مرحلے میں ان چیزوں میں نکھار آتا ہے جو چیزیں پہلے مرحلہ میں وجود میں آچکی ہوتی ہیں۔

ارتفاق سوم: انسانوں میں اگر انتشار و افتراق واقع ہو تو اس کے لئے ایک ذی حیثیت سردار یا حاکم کا وجود میں آنا لازم ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک اس مرحلے میں ایک حاکم یا سردار وجود میں آتا ہے۔

ارتفاق چہارم: یہ شاہ صاحب کے نزدیک وہ مرحلہ ہے جس میں ایک عالمی سطح کے حاکم کی ضرورت پڑتی ہے جو زمین کے مختلف حکمرانوں کے درمیان امن امان قائم رکھے۔ شاہ صاحب کے نزدیک وہ خلیفہ ہے۔[1]

دور جدید میں عمرانیات کے تعلق سے جو نظریات پیش کئے گئے ان میں ایک نظریۂ ارتقاء (Evolution theory) ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسانی سماج ایک ارتقائی عمل کے ذریعہ اپنی موجودہ پوزیشن تک پہنچ سکا ہے۔ اگرچہ یورپ کے ان ماہرین عمرانیات نے ارتقائی عمل کے نظریے کی تفصیل میں کچھ اختلاف بھی کیا ہے مگر بنیادی طور پر وہ سماج کے ارتقائی عمل کے نظریہ کے قائل ہیں۔ ان ماہرین عمرانیات میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں: آگسٹ کومٹے (م: ۱۸۵۷)، کارل مارکس (م: ۱۸۸۳)، ہربرٹ اسپنسر (م: ۱۹۰۳) اور نیکولاس لوہمان (م: ۱۹۹۸)۔

ان ماہرین میں کچھ بلاواسطہ اور کچھ بالواسطہ نظریۂ ارتقاء سے جڑے ہوئے ہیں۔ ارتقائی عمل کے ذریعے پروان چڑھنے کے نظریے کو ماننے کے باوجود ان ماہرین کا نظریۂ ارتقاء اس نظریے سے کسی حد تک مماثل یا مختلف ہے جس کے شاہ ولی اللہ دہلوی قائل ہیں۔ ان سطور میں اسی حقیقت کا جائزہ جدید ماہرین عمرانیات کے نظریات کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے:

آگسٹ کومٹے: اس کو عمرانیات کا بانی مفکر تسلیم کیا جاتا ہے۔ عمرانیات کو جدید بیانیہ میں Sociology کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس اصطلاح کو وضع کرنے کا سہرا آگست کومٹے

---

[1] دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ص ۳۹ - ۴۸۔

کے سر باندھا جاتا ہے[۲]۔

آگسٹ کومٹے کی نظر میں انسانی سماج ارتقاء کے مندرجہ ذیل تین مراحل طے کر کے متمدن دنیا تک پہنچا ہے:

۱۔ مذہبی یا خیالی مرحلہ (Theological or fictional stage): اس سے کومٹے کی مراد انسانی سماج کا وہ مرحلہ ہے جس میں لوگ خداؤں کی طرف مائل تھے اور ہر چیز، جیسے بارش کا ہونا، بجلی کا گرجنا اور آگ وغیرہ کے لئے خداؤں کی طرف رجوع کرتے تھے۔

۲۔ مابعد الطبیعی مرحلہ (The Metaphysical Stage): اس سے کومٹے کی مراد انسانی سماج کا وہ مرحلہ ہے جس میں انسان کسی مافوق الفطرت ہستی کے بجائے ایسی مابعد الطبیعی طاقتوں پر یقین رکھتا ہے جس میں کسی شخصیت کا عمل دخل نہ ہو۔

۳۔ مثبت یا سائنسی مرحلہ (The positive or Scientific stage): انسانی سماج کا وہ دور جس میں انسان نے کائنات اور زندگی سے جڑے مسائل کی حقیقت کو سائنسی اصولوں کی روشنی میں دیکھنا شروع کیا[۳]۔

آگسٹ کومٹے کے اس ارتقائی نظریے کا تقابل شاہ ولی اللہ کے نظریہ ارتفاقات سے کیا جائے تو اس میں بنیادی طور پر ارتقاء کے باب میں دو مختلف نظریات سامنے آتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا نظریہ حقیقی طور پر وہ ارتقائی عمل دکھائی دیتا ہے جس میں سماج ایک بنیاد پر قائم ہو کر ترقی کے منازل طے کرتا نظر آتا ہے۔ سماج کا دائرہ وسیع ہونے کی بنا پر اس کا ارتقائی عمل شروع ہوتا ہے، جیسے شادی شدہ زندگی کے معاملات، روزی روٹی کے تعلق سے انسانی ضروریات اور اسی طرح انسانوں کا رہائش اختیار کرنے کے معاملات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ انسانی سماج میں ترقی کے ساتھ ساتھ ان سب ضروریات زندگی میں نکھار آتا گیا۔ اسی طرح انسانوں کے آپس میں درپیش نزاع کے مسائل کا مقامی دائرے سے نکل کر حاکموں کے درباروں تک پہنچنا۔ یہ سب شاہ ولی اللہ کی نظر میں ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے متمدن دنیا تک رسائی حاصل کرنے کے مراحل ہیں۔

---

[۲] Coser, Lewis A, *Masters of Sociological Thought,* Rawat Publications, Delhi, 2017, p 3.

[۳] Abraham M. Francis, *Contemporary Sociology*, Oxford University Press, 2020, p.10

آگسٹ کومٹے کے نظریۂ ارتقاء میں ہم واضح طور پر انسانی سوچ کی تبدیلی دیکھتے ہیں۔ اس کی رو سے سماج کا کسی بنیاد پر قائم ہو کر ترقی کرنے کے بجائے انسانی سوچ کا تبدیل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس میں زمانے کے ساتھ ساتھ انسانی سوچ کا انتقال (shift) دکھائی دیتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے انسان پہلے مذہبی دیوتاؤں اور خداؤں کا پرستار تھا پھر مابعد الطبیعی طاقتوں کے نظریے کا قائل ہوا اور پھر ترقی کے زمانے میں سائنسی اور علمی بنیادوں پر مسائل کو دیکھنے لگا۔ دونوں نظریات کے تقابل کے نتیجہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کا نظریہ انسانی سماج کی ترقی کا نام ہے اور آگسٹ کومٹے کا نظریہ انسانی فکر کی تبدیلی کا نام ہے۔

۲۔ کارل مارکس: مارکس ایک جرمن ماہر سماجیات تھا جسے کمیونزم کے انقلابی نظریے کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ عمرانیات میں اسے تاریخی مادیت (Historical Materialism) کے نظریے کا بانی بھی قرار دیا جاتا ہے۔[۴]

وہ عمرانیات میں نظریۂ تصادم (Conflict Theory) کا قائل ہے جس کی رو سے انسانی سماج دائمی کشمکش میں مبتلا ہے جس میں صاحب ثروت اور معاشی طور پر کمزور طبقات کے درمیان آپسی کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ مارکس کے نظریے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کے سامنے سماج میں پیداوار کے تعلق سے گروہوں کے درمیان کشمکش ہی سماج کی اصل ہے۔ یہی کشمکش سماج کے اتار چڑھاؤ اور آگے بڑھنے کی بنیاد ہے۔

مارکس کے نظریے پر پوری طرح مادیت اور مادی کشمکش چھائی ہوئی ہے۔ اس نظریے کی رو سے قدیم زمانے میں شکار پر گزر بسر کرنے والے انسان سے لے کر آج کے صنعتی دور میں بسنے والے انسان تک مادیت ہی سماج کی بنیاد ہے جس کے ارد گرد سماج کا تانا بانا آپس میں بنا اور بندھا ہوا ہے۔ مارکس کی نظر میں مادیت پر مبنی ایک دائمی کشمکش ہی دوسرے اداروں کی اصل ہے یہاں تک کہ وہ مذہبی اشرافیہ کو بھی مادیت کے نتائج میں شمار کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا نظریۂ ارتفاقات اس ارتقائی نظریے سے بنیادی طور پر مختلف بلکہ متصادم ہے۔ شاہ صاحب کی نظر میں مادہ اگرچہ معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دیتا ہے مگر سماج کی اصل ان کے نزدیک وہ فطری ضرورت ہے جو انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ شاہ صاحب کی نظر میں

---

[۴] Oxford University press UK, *Oxford Dictionary of sociology*, edition2014, p. 446

مادہ انسانی سماج کی ترقی میں اہم بنیاد ہے مگر یہ تصادم کا سبب نہیں بلکہ باہمی تعامل کا ذریعہ ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک مادہ یا معیشت نہیں بلکہ اس کی غیر منصفانہ تقسیم سماج کے لئے نقصاندہ ہے۔ شاہ صاحب اس تعلق سے وضاحت کرتے ہیں:

وغالب سبب خراب البلدان في هذاالزمان شيئان: أحدهما: تضييقهم على بيت المال، بأن يعتادوا التكسب بالأخذ منه---

(اس زمانہ میں ملک کی ویرانی کے بڑے اسباب دو ہیں۔ ایک: لوگوں کا بیت المال پر بوجھ بننا ہے، اس طرح کہ لوگ بیت المال سے لینے کے ذریعے کمائی کرنے کے عادی بن گئے ہیں)۔

والثاني: ضرب الضرائب الثقيلة على الزراع والتجار والمتحرفة، والتشديد عليهم، حتى يقضى إلى إجحاف المطاوعين واستئصالهم، وإلى تمنع أولى بأس شديد، وبغيهم---

(اور دوسرا سبب کاشتکاروں، تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگانا ہے اور ان پر سختی کرنا ہے، یہاں تک کہ یہ چیز فرمانبرداروں کو بہالے جاتی ہے اور ان کو جڑ سے مٹادیتی ہے جبکہ طاقتور لوگ ٹیکس دینے سے انکار کرتے ہیں، اور بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں...)[۵]

اسی طرح مارکس کے نزدیک مادہ سماج میں تصادم کی بنیاد ہے اور یہ تصادم سماج میں نئے نئے روپ دھار کر سماج کو آگے بڑھاتا ہے جبکہ مادہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک سماج کی ایک اہم بنیاد ہے اور مادہ کی غیر منصفانہ تقسیم سماج میں انتشار پھیلاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک دولت اور اخلاق سماج کے ایک سکے کے دورخ ہیں۔ مارکس کے نظریۂ ارتقاء کے مقابلے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نظریۂ مادہ ہے اور دولت کے تعلق سے ایک متوازن اور مثبت نظریہ ہے۔

ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer 1820-1903) ایک برطانوی ماہر عمرانیات ہے جس نے ۱۸۹۶ء میں عمرانیات Sociology پر اپنی پہلی کتاب Principles of Sociology لکھی۔ اسپنسر ڈارون کے نظریہ "نامیاتی ارتقاء" (Organic evolution) سے متاثر مفکرین میں سے تھا۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان ایک ارتقائی عمل کے ذریعہ اپنے وجود کے اس ترقی یافتہ مرحلے تک پہنچ گیا ہے جسے آج "انسان" کہتے ہیں۔ ڈارون کے مطابق انسان کے وجود میں آنے کے درمیان "بقاء اقوی" survival of the fittest کا اصول قائم رہا یعنی انسانی جین کے پروان چڑھنے میں طاقتور جین نے نشو ونما پاکر ارتقاء کے ذریعہ انسان کا روپ دھار لیا۔

ہربرٹ اسپنسر نے سماجی ارتقاء Social evolution کا نظریہ قائم کیا اور سماجیات کے ضمن

---

(۵) دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، کتب خانہ رشیدیہ، دہلی، ص ۴۵۔

میں "بقاءاقویٰ" کے اصول کے تحت یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانی سماجوں میں وہی سماج آگے بڑھتا ہے جو قابل اور طاقتور ہو۔اس نظریے کو سوشل ڈاروینیت Social Darwinism کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

ہربرٹ اسپنسر کے نظریے کا شاہ ولی اللہ دہلوی کے نظریہ ارتفاقات سے تقابل کیا جائے تو ہمارے سامنے اسپنسر کا نظریہ ایک عمومی نظریے کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جس میں سماج کے تعلق سے ایک اصول بتایا گیا ہے کہ کون سا سماج دوسرے سماجوں سے آگے بڑھتا ہے اور اس میں اسپنسر کے نزدیک قابلیت ایک بنیادی چیز ہے۔شاہ صاحب کا نظریہ ارتفاقات سماج کے تعلق سے مختلف ارتقائی مراحل کا نام ہے جس میں سماج کے ارتقائی عمل کا ذکر بحیثیت مجموعی کیا گیا ہے۔اس میں کسی سماجی مقابلہ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

نیکلاس لوہمن(1927-1998) Niklas Luhmann: لوہمن بیسویں صدی عیسوی کا ماہر عمرانیات ہے جو پہلے ایک وکیل کی حیثیت سے پارلیمنٹری ایڈوائزر تھا۔اس کے بعد اس نے اپنا تعلیمی کیریئر عمرانیات میں شروع کیا۔لوہمن کی نظر میں سماجی نظام، ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بھی تبدیلی لاتا رہتا ہے تاکہ سماج اور ماحول کے درمیان تعلق قائم رہے۔ لوہمن نیکلاس کے نظریہ ارتقاء کا سیدھا اور آسان سا مطلب یہ ہے کہ لوہمن کی نظر میں سماج کو ترقی دینے والا کوئی اور نہیں بلکہ خود وہ بدلتا ہوا ماحول ہے جو سماج کو آمادہ کرتا ہے کہ اپنے نظام میں وسعت لائے اور ماحول کے ساتھ چلے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے نظریہ ارتفاقات کے لوہمن کے نظریہ ارتقاء سے تقابل کے نتیجے میں جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔لوہمن کے سماجی ارتقاء کے نظریے کی رو سے سماج میں ارتقاء کسی ضابطے کے تحت نہیں بلکہ ایک مجبوری کے تحت ہوتا ہے۔سماج بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ کوئی قدم اٹھائے اور ضروری نہیں کہ وہی قدم صحیح بھی ہو، جبکہ شاہ ولی اللہ دہلوی کی نظر میں سماج میں ارتقاء ایک ضابطے کے تحت اور ایک فطری تقاضے کے پیش نظر ہوتا ہے جو کہ انسانی فطرت میں ودیعت ہے۔

۲۔لوہمن کی نظر میں سماج اور اس کے ارتقاء میں کوئی ہم آہنگی نظر نہیں آتی بلکہ سماج مجبوری کے تحت نئے حالات سے نمٹنے کے لئے متبادل اختیار کرتا ہے جو صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔اس کے برعکس شاہ صاحب کی نظر میں سماج اور اس کے ارتقاء میں ایک زبردست ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

۳۔لوہمن کی نظر میں سماج اور نئے بدلتے ماحول کے درمیان ایک تصادم کی کیفیت ہوتی ہے جس

کے نتیجے میں سماج اس سے مصالحت کرنے پر مجبور ہوتا ہے، جبکہ شاہ ولی اللہ کی نظر میں سماج اور بدلتا ہوا ماحول دونوں ایک ضابطے کے تحت آگے بڑھتے ہیں جس میں کسی ٹکراؤ کی صورت نہیں بلکہ ایک فطری زاویہ کار فرما ہوتا ہے۔

خلاصۂ بحث: متعدد ماہرین عمرانیات نے اپنے عمرانی نظریات میں سماج کے ارتقاء سے کسی حد تک بحث کی ہے۔ اس مضمون میں چار مفکرین کا انتخاب کیا گیا ہے اور ان کے بنیادی نظریات کے تعلق سے بات کی گئی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نظریۂ ارتفاق کا عمرانیات کے جدید مفکرین کے ارتقائی نظریات سے تقابل کیا گیا ہے اور ارتقاء کے تعلق سے ولی اللّٰہی نظریات اور اس تعلق سے جدید نظریات کے بنیادی تصورات سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ صاحب کے نظریۂ ارتفاقات میں جو بنیادی تصورات ہیں وہ اسے دوسرے ارتقائی نظریات سے مختلف بناتے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ شاہ صاحب سماج کو انسان کی ایک فطری ضرورت قرار دیتے ہیں۔ اسی تصور کی روشنی میں شاہ صاحب کا ارتقائی نظریہ گردش کرتا ہے۔ جبکہ دوسروں کے نزدیک سماج کا پہلے سے کوئی تصور انسان میں موجود نہیں ہے۔

۲۔ شاہ صاحب کی نظر میں سماج انسان کی ضرورت کے مطابق ترقی کرتا ہے۔ ان کی نظر میں انسان کی تخلیق کرنے والا اللہ ہی سماجی فطرت انسان میں ودیعت کرتا ہے اور سماج کو آگے بڑھانے اور اس کو ترقی دینے کی رہنمائی کرتا ہے۔ دوسروں کے نزدیک سماج انسان کا پیدا کردہ نظام ہے۔

۳۔ شاہ صاحب کی نظر میں سماج کے پورے نظام کو چلانا انسان کا کام ہے۔ سماج کی اکائیوں میں توازن قائم کرنا، جن میں خاص طور پر معیشت ہے، انسان کا کام ہے۔ ان کے نزدیک دولت کی منصفانہ تقسیم سماج کی گاڑی کو چلانے والے پہیے کی مانند ہے جبکہ کارل مارکس جیسے مفکرین کے نظریے کے مطابق دولت ہی اصل سماج ہے اور اسی کے اردگرد سماج کے تمام اقدار گھومتے ہیں۔

۴۔ ان کے نزدیک انسان ان صلاحیتوں سے مالامال ہے جو سماج کی تعمیر میں اس کی رہنمائی کرتے ہیں جبکہ لوہمن جیسے ماہر عمرانیات کی نظر میں سماج انسان کی کسی فطرت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ماحول ہے جو سماج کو بدلنے پر مجبور کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ شاہ صاحب اسلامی مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ تجرباتی علوم سے استفادہ کرتے ہوئے انسانی معاشرے کی تعبیر بیان کرتے ہیں۔

وقف ترمیمی بل ۲۰۲۴: ادارے کی سالمیت اور تحفظ کے لئے چیلنج

عادل حسین وگے
ریسرچ اسکالر، اسلامک یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اونتی پورہ، کشمیر
Ibnahad4765@gmail.com

وقف ایک خیراتی ادارہ ہے جس میں واقف (وقف کرنے والا) اصل اثاثے کو محفوظ رکھتے ہوئے مجوزہ مستفیدین کو مسلسل فوائد فراہم کرنے کے لئے جائیداد ہمیشہ کے لئے مختص کرتا ہے۔ اس جائیداد سے حاصل ہونے والی آمدنی کو صرف نامزد مستفید افراد میں تقسیم کیا جاتا ہے[۱] یا اسلامی قانون کے مطابق فلاحی کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے[۲]۔ وقف کے درست ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اسکی تین اہم خصوصیات ہوں:[۳]

۱۔ مستقل یعنی وقف کے مستقل وجود کو یقینی بنانا۔

۲۔ ناقابل تنسیخ یعنی موقوفہ جائداد کا واقف کی طرف سے تبدیلی یا واپسی کو روکنا۔

۳۔ لاتعلقی یعنی واقف یا متولّی کا متعلقہ جائداد کو فروخت یا منتقلی کی ممانعت کرنا۔

اسکے علاوہ وقف کی ساخت میں چار ضروری اجزاء شامل ہیں، جن کی غیر موجودگی میں وقف کا قیام ممکن نہیں[۴]:

---

(۱) Minlib Dallh, "Accumulate but Distribute: Islamic Emphasis on the Establishment of Waqf", *Religion and Development*, 2, 2023, pp.21-40.

(۲) H.K. Janbaz, *Law Relating to Auqaf in India,* Universal Law Publishing, 2017, p.42.

(۳) Muhammad Zubair Abbasi, "The Classical Islamic Law of Waqf: A Concise Introduction", *Arab Law Quarterly*, 26(2), 2012, pp. 121-153. See also Janbaz, H.K. (2017), *Law Relating to Auqaf in India.* India:Universal Law Publishing, pp.8-10.

(۴) Mohammad Abdullah, "Reflection of Maqāsid al-Sharī'ah in the classical Fiqh al-Awqāf", *Islamic Economic Studies*, 27(2), 2020, pp. 79-90.

۱۔ واقف یعنی وقف کرنے والا۔
۲۔ موقوف علیہ یعنی وقف سے استفادہ حاصل کرنے والے۔
۳۔ متولی یعنی جو واقف کی ہدایت کے مطابق وقف کا انتظام چلاتا ہے۔
۴۔ متعینہ جائیداد جو وقف کی جاتی ہے۔

کسی بھی جائیداد کو وقف کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ جائیداد واقف کی ملکیت میں ہو۔ کسی فرد کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ایسی جائیداد کو وقف کرے جو اس کی ملکیت نہ ہو۔ یہ شرط اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ واقف کو وقف کرتے وقت متعلقہ جائیداد پر مکمل قانونی اختیار حاصل ہو۔ صرف اس طرح سے وقف کے جواز اور قانونی حیثیت کی تصدیق ہوتی ہے[۵]۔

ہندوستان میں وقف املاک کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، جس سے یہ ملک میں مسلح افواج اور ہندوستانی ریلوے کے بعد تیسرا سب سے بڑا زمین دار ادارہ ہے۔ ہندوستان دنیا بھر میں وقف اثاثوں کی سب سے زیادہ تعداد بھی رکھتا ہے، یہاں تک کہ مسلم اکثریتی ممالک کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے جو وسیع پیمانے پر وقف املاک کے مؤثر نظم و نسق اور انتظام کی ضرورت کو اجاگر کرتی ہے تا کہ سماجی و اقتصادی ترقی میں ان کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور شراکت کو یقینی بنایا جاسکے[۶]۔

ہندوستان میں وقف قواعد و ضوابط کا سفر انیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہوتا ہے جب انگریزوں نے بنگال کوڈ ۱۸۱۰ کے ریگولیشن کا آغاز کیا[۷]۔ ان قواعد و ضوابط کے تحت وقف کو منظم کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی[۸]۔ اس ابتدائی کوشش کے بعد یہ سلسلہ مدراس کوڈ ۱۸۱۷ کے

---

[۵] Shami,I.A. *Fatawa Shāmī*, vol,8, Lahore: Zia ul Quran publications, 2017, p.63.

[۶] Wagay.A.H., "The Economic Value of Waqf Assets in India: A Study of the Sachar Committee's Report",*Urban India*, 44(2), 2024, pp.85-89.

[۷] *Bengal Regulation XIX of 1810*. Accessed on 12 March,2024. http://bdlaws.minlaw.gov.bd/act-1316.html#:~:text=A%20Regulation%20for%20the%20due,of%20nazul%20property%20or%20escheats.

[۸] *The Regulation VII of 1817 of the Madras Code* .Accessed on 12 March, 2024. https://www.indiacode.nic.in/show-data?actid=AC_CEN_3_20_00032_186320_1523267123192&orde

ریگولیشن نگرانی ۱۸۳۹ تک جاری رہا، جب عیسائی مشنریوں نے احتجاج کیا کہ یہ عیسائی حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے جو مسلمانوں کے خیراتی عطیات کی نگرانی اور ان کی دیکھ بھال کا انتظام کرے۔ چنانچہ انگریزوں نے ہندوستان میں وقف املاک کی نگرانی روک دی[۹]۔ تاہم انگریزوں کی ان دو ابتدائی کوششوں نے مسلمانوں کے وضع کردہ اوقاف کے انتظام کو درہم برہم کر دیا کیونکہ انگریزوں نے قاضی کے ادارے کو ختم کر دیا تھا[۱۰]۔ مزید بر آں انگریزوں نے مسلمانوں کی مزاحمت کو دبانے کے لئے ۱۸۶۳ میں لینڈرز پٹشن ایکٹ منظور کیا، جس کے نتیجے میں وقف زمینوں پر ٹیکس عائد کرنے سے اوقاف کو شدید دھچکا لگا[۱۱]۔ ان ابتدائی قواعد وضوابط کے بعد ہندوستان میں اور بھی وقف قواعد وضوابط بنے جس کا آغاز ۱۹۱۳ کے مسلمان وقف ویلیڈیٹنگ ایکٹ کے تعارف کے ساتھ ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ اور ۱۹۳۰ کے ایکٹ بنے[۱۲]۔ تاہم ان تمام قوانین کے باوجود انگریز ہندوستان میں اوقاف کو منظم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے حالانکہ ان کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو ۱۸۵۷ کی بغاوت میں مرکزی کردار ادا کرنے کے لئے سزا دینا تھا[۱۳]۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں وقف کے غیر تسلی بخش حالات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی اور بالآخر وقف ایکٹ ۱۹۵۴ کو ہندوستانی پارلیمنٹ نے منظور کیا[۱۴]۔ یہ ایکٹ وقف کے بارے میں آزاد ہندوستان کا پہلا قانون ہے، جس میں کئی بار ترمیم کی گئی ہے جس میں ۱۹۵۹، ۱۹۶۴ اور ۱۹۶۹ شامل ہیں۔ ۱۹۸۴ میں وقف بورڈوں کا کام تسلی بخش نہ ہونے کی وجہ سے جامع ترامیم کی گئیں۔ اس کے

---

rno=23

[۹] Kader.S.A.(2008), *The Law of Waqfs: An Analytical and Critical Study*, Kolkata: Eastern Law House, pp.6-7.

[۱۰] Hussain, M .(2021). Muslim Endowments, Waqf Law and Judicial Response in India, London: Routledge, p.XII.

[۱۱] *Sachar Committee report, 2006*, p.218--https:// www. minorityaffairs. gov.in/sites/default/files/sachar_comm.pdf (accessed 15 April, 2024)

[۱۲] Hussain, M., *op. cit.*, p. XV.

[۱۳] Faizi, A.A.A.(n.d.). *Waqf Record Management In India,* Centre For Rural Studies Lal Bahadur Shastri National Academy O Administration Mussoorie, pp.25-29.

[۱۴] *Waqf Act 1954* -- accessed on 12 March, 2024. http://www.keralastateWaqfboard.in/forms/act1954.pdf

علاوہ وقف بورڈوں کی مالی حالت بھی خراب ہوئی تو مرکزی سرکار نے بنیادی طور پر وقف انکوائری کمیٹی کی سفارشات پر مشتمل ترامیم کی شکل میں ضروری اقدامات اٹھائے۔ اس کی بعد 1995 میں ہندوستانی مرکزی مقننہ نے وقف ایکٹ 1995 کو منظور کیا جس میں ۱۹۸۴ کے ترمیمی ایکٹ کی مختلف ترامیم شامل تھیں[(۱۵)]۔

سنہ 1995 کا وقف ایکٹ ہندوستان میں وقف کو چلانے والا سب سے اہم قانون ہے جس کے بعد اس ایکٹ میں ۲۰۱۳ میں ترمیمات کی گئیں[(۱۶)]۔ آزادی سے لے کر ۲۰۱۳ کے ترمیمی قانون کے نفاذ تک حکومت ہند کے اقدامات کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ وقف کے انتظام کو ہموار کرنے اور اس کے انتظام کو بہتر بنانے کے لئے کوشش کی گئی ہے۔

وقف ترمیمی بل ۲۰۲۴ کا جائزہ لینے سے ایک مختلف سمت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مجوزہ ترامیم ہندوستان میں وقف ادارے کے بنیادی اصولوں کو کمزور کرتی نظر آتی ہیں، جس سے ممکنہ طور پر وقف املاک پر مزید تجاوزات میں مدد ملے گی اور بدانتظامی اور اثاثوں کے غلط استعمال کے مسائل میں اضافہ ہو گا۔ مندرجہ ذیل نکات اس بل کے ذریعے وقف کو کمزور کرنے کے حکومت کے ارادوں کو واضح کرتی ہیں:

- وقف ترمیمی بل ۲۰۲۴ وقف املاک کے انتظام اور ریگولیشن کو نمایاں طور پر تبدیل کرتا ہے، جس سے اس ادارے کی سالمیت اور تحفظ کے لئے چیلنج پیدا ہوتا ہے۔ اس بل میں وقف املاک کے سروے کا اختیار سروے کمشنر سے لے کر کلکٹر کو تفویض کیا گیا ہے جس سے بورڈ کے اختیارات چھین لئے گئے ہیں[(۱۷)]۔ مزید برآں، بل میں کہا گیا ہے کہ صرف وہ افراد جو کم از کم پانچ سال تک مسلمان رہے ہوں، وقف تشکیل کرسکتے ہیں۔ یہ تجویز ایک پابندی عائد کرتی ہے[(۱۸)]۔ صارف کے ذریعہ وقف کی اجازت دینے والی شق

[(۱۵)] Kader.S.A. *op. cit.*, pp.11-12.

[(۱۶)] Kader.S.A. *op.cit.*, p.12.

[(۱۷)] Waqf Amendment Bill, 2024, Section 5 (*b*) https://prsindia.org/files/bills_acts/bills_parliament/2024/Waqf_(Amendment)_Bill_2024.pdf

[(۱۸)] Section 3 (*ix*)

کو، جو پرنسپل ایکٹ میں موجود تھی، مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے[19]۔ اس بل کے نافذ ہونے سے پہلے یا بعد میں وقف املاک کے طور پر شناخت یا اعلان کردہ کسی بھی سرکاری جائیداد کو اب وقف املاک کے طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ جائیداد سرکاری ملکیت میں ہے یا نہیں، اس معاملے کو جانچ کے لئے مقامی کلکٹر کے پاس بھیجا جائے گا۔ جب تک کلکٹر رپورٹ پیش نہیں کرتا ہے اس وقت تک جائیداد کو وقف املاک کے طور پر نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر کلکٹر اس بات کا تعین کرتا ہے کہ جائیداد سرکاری ملکیت ہے تو اس صورت میں ریوینیو ریکارڈ میں ضروری اصلاح کی جائے گی اور ریاستی حکومت وقف بورڈ کو اس کے مطابق اپنے ریکارڈ کو درست کرنے کی ہدایت دے گی[20]۔

- بل میں اس سابقہ دفعہ کو بھی خارج کر دیا گیا ہے جو چیف ایگزیکٹو آفیسر کو وقف رقم یا جائیداد کے غلط استعمال یا دھوکہ دہی یا وقف فنڈز سے غیر مجاز یا نامناسب اخراجات کرنے کے قصوروار پائے جانے والے متولیوں یا کسی بھی افسر کے خلاف کاروائی کرنے کا اختیار دیتا تھا۔ اس سے پہلے چیف ایگزیکٹو آفیسر کو ملزم کو یہ وضاحت کرنے کا معقول موقع دینے کی ضرورت تھی کی بازیابی کا حکم کیوں نہیں دینا چاہیے۔ وضاحت پر غور کرنے کے بعد چیف ایگزیکٹو آفیسر جائیداد کے غلط استعمال کی رقم یا نامناسب اخراجات کا تعین کرے گا اور پھر اس شخص کو مقررہ رقم واپس کرنے اور مقررہ وقت کے اندر جائیداد کو وقف کو بحال کرنے کا حکم دے گا[21]۔
- اس بل میں وقف املاک سے متعلق جرائم کو غیر قابل شناخت اور قابل ضمانت قرار دیتے ہوئے قانونی فریم ورک میں مزید ترمیم کی گئی ہے[22]۔ یہ متولیوں کو وقف املاک کا قبضہ دینے کے بورڈ یا ٹریبونل کے احکامات سے انکار کرنے اور بورڈ کی ہدایات کو نظر انداز

---

[19] Section 3 (*ix*) *b*

[20] Section 20

[21] Section 17 (*b*)

[22] Section 26 (*b*)

کرنے کی بھی اجازت دیتا ہے(۲۳)۔ اس کے علاوہ وقف کے مناسب انتظام کے لئے ایک اسکیم تیار کرنے کا بورڈ کا اختیار اب متولیوں کو پابند نہیں کرے گا(۲۴)۔ اس سے پہلے اگر وقف بورڈ کو سماعت کا موقع دیے بغیر حصول اراضی قانون ۱۸۹۴ کی دفعہ ۳۱ یا ۳۲ یا اسی طرح کے قوانین کے تحت کوئی حکم دیا جاتا تھا تو اس حکم کو کالعدم قرار دیا جاتا تھا اگر بورڈ اس اتھارٹی کے پاس درخواست دیتا تھا جس نے اس کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے ایک ماہ کے اندر حکم جاری کیا تھا۔ مجوزہ ترمیم میں اب کہا گیا ہے کہ اس طرح کے حکم کو روک دیا جائے گا(۲۵)۔ دوسرے لفظوں میں بورڈ کے اختیارات بہت کم کر دیے گئے ہیں۔

- اس کے علاوہ اس بل میں غیر مسلموں کے ذریعے وقف کی تشکیل کی شق کو خارج کر دیا گیا ہے(۲۶)۔ پرنسپل ایکٹ کی اس شق کو بھی خارج کر دیا گیا ہے جو متروکہ وقف املاک پر لاگو ہوتا ہے جو متروکہ وقف املاک بننے سے پہلے وقف کا حصہ تھے(۲۷)۔ آخر میں بل پرنسپل ایکٹ کے اس حصے کو منسوخ کرتا ہے جو اس وقت نافذ العمل کسی بھی دوسرے متضاد قوانین یا قانونی آلات پر اس کی ترجیح کو یقینی بناتا تھا(۲۸)۔

ہندوستان میں وقف اثاثوں کی سب سے زیادہ تعداد ہے، جو مسلمانوں کی معاشرتی ترقی کے لئے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ تاہم یہ اثاثے بدانتظامی اور بدعنوانی کا شکار ہیں۔ ان وسیع وقف اثاثوں سے حاصل ہونے والے فوائد کو بہتر بنانے کے لئے حکومت ہند سے توقع کی جارہی تھی کہ وہ وقف ایکٹ ۱۹۹۵ کو مزید مضبوط بنائے گی۔ بدقسمتی سے موجودہ حکومتی اقدامات وقف نظام کو مزید کمزور

---

(۲۳) Section 28 (*e*)

(۲۴) Section 32 (*a*)

(۲۵) Section 37 (*c*) *ii*

(۲۶) Section 40

(۲۷) Section 41

(۲۸) Section 41

کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان میں وقف انتظامیہ کو ہموار کرنے کے لئے جوائنٹ پارلیامانی کمیٹی سچر کمیٹی رپورٹ اور محمود الرحمن کمیٹی کی رپورٹ کی سفارشات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ان سفارشات کو نافذ کرنے سے وقف اثاثوں کے انتظام، شفافیت اور افادیت میں اضافہ ہو سکتا ہے جس سے ان کے سماجی واقتصادی اثرات کو مزید بڑھایا جاسکتا ہے۔

وقف ایکٹ ۱۹۹۵اور وقف ترمیمی بل ۲۰۲۴ ہندوستان میں وقف املاک کے انتظام اور ریگولیشن کے لئے دو بالکل مختلف طریقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ۱۹۹۵ کے ایکٹ کا مقصد وقف املاک کی شفافیت، تحفظ اور مناسب استعمال کو یقینی بنانے کے لئے وقف کے انتظام کو مستحکم، ہموار اور بہتر بنانا تھا۔ اس کے برعکس ۲۰۲۴ کے ترمیمی بل میں ایسی تبدیلیاں متعارف کرائی گئی ہیں جو وقف ادارے کی سالمیت اور تحفظ کو نمایاں طور پر چیلنج کرتی ہے جس سے وقف اثاثوں کے ممکنہ قبضے اور ختم ہونے کے بارے میں خدشات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں قانون سازی کے ارادے میں تبدیلی کی عکاسی کرتی ہیں۔ تحفظ اور اضافے پر توجہ مرکوز کرنے سے ہٹ کر یہ مجوزہ قانون ایک ایسی تبدیلی کی طرف بڑھتا قدم ہے جس سے ہندوستان میں وقف کے مسلسل وجود اور مؤثر انتظام کو کافی خطرات لاحق ہیں۔

ترکی میں آٹھ یادگار دن

ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں

میں گزشتہ تقریبا۱۵-۲۰سال کے دوران بارہا ترکی گیا ہوں۔ لیکن حالیہ سفر سے پہلے کے تمام اسفار، استنبول یا اس کے آس پاس کسی مقام پر کانفرنسوں میں شرکت کے لئے ہوئے۔ کانفرنسوں میں شرکت کے لئے اس طرح کے سفر دو چار دن کے مختصر اور انتہائی مصروفیت کے ہوتے ہیں۔ ان کے دوران اپنے میزبانوں یا دیگر شرکاء سے تفصیلی ملاقاتوں اور تعارف کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ تاریخی مقامات کی سیاحت اوران کے پس منظر کو دیکھنے سمجھنے کا موقع بھی تو شاید و باید ہی ملتا ہے۔ لیکن میرا حالیہ سفر، جس کی یہ مختصر روداد ہے، اس اعتبار سے مختلف رہا کہ اس دوران ملاقاتوں اور تاریخی مقامات کو دیکھنے کے مواقع خوب ملے۔ یہ سفر ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہوا، جس کی میزبانی ترک اساتذہ کی قومی انجمن "اوگ دیر" Öğ-Der نے کی تھی۔ یہ ان متعدد تنظیموں میں سے ایک ہے جن کی داغ بیل عظیم ترک رہنما نجم الدین اربکان (وفات ۲۷ فروری ۲۰۱۱) نے یا ان کے رفقاء کار نے بعد میں ڈالی۔

اربکان مرحوم وہ شخصیت ہیں جنہوں نے ترک معاشرے کو، جو ایک مدت سے جبری مذہب مخالف سیکولر نظام کے تحت جی رہا تھا، اس کی حقیقی اسلامی شناخت واپس دلائی جو ترکوں کے لئے باعث افتخار ہے۔ جولائی سنہ ۱۹۲۳ء کے لوزان معاہدے کے تحت ترک اشرافیہ کے تسلیم شکست اور خود سپردگی کے نتیجے میں دینی شعائر پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں اور ترک قوم کی اصل دینی شناخت کو جبراً تبدیل کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس معاہدے کا وجود ابھی باقی ہے مگر صرف نام بھر کو، ورنہ ترکی اور اس کے قرب وجوار کے ممالک میں اس قدر تبدیلیاں آچکی ہیں کہ ان کی وہ سابقہ شناخت تقریباً معدوم ہوگئی ہے جو اس معاہدے کا نتیجہ بن گئی تھی۔

اربکان مرحوم پیشے سے ایک نامور انجینئر تھے اور ان کا وقار عوام اور حکمران دونوں طبقوں میں قائم تھا۔ انہوں نے اعلیٰ مناصب پر ملک کی خدمات انجام دیں۔ مرحوم نے پہلے تو نظام کے نقائص کو اندر سے تبدیل کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے جلد ہی سمجھ لیا کہ یہ تدبیر کارگر نہیں ہوگی۔

چنانچہ انہوں نے سنہ ۱۹۷۰ میں اپنی سیاسی تنظیم "ملی نظام پارٹی" قائم کی۔ لیکن اس پارٹی کو ایک سال ہی میں وزیراعظم سلیمان دیمیریل نے یہ کہہ کر کالعدم کر دیا کہ یہ سیکولر نظریے کی مخالف ہے۔ اربکان نے جلد ہی دوسری پارٹی بنالی جس کا نام تھا "ملی سلامت پارٹی"۔ اس پارٹی نے الیکشن میں کامیابی سے حصہ لیا اور حکومت میں شریک ہوئی۔ قبرص بحران کے دوران اربکان حکمراں اتحاد میں شامل رہے اور ۲۸ جنوری تا ۱۷ نومبر ۱۹۷۴ ریپبلکن پیوپلز پارٹی کے رہنما بلند اجوید کی کابینہ میں نائب وزیراعظم رہے۔ وہ دوسری بار ۳۱ مارچ ۱۹۷۵ سے ۲۱ جون ۱۹۷۷ تک اور تیسری مرتبہ ۲۱ جولائی ۱۹۷۷ سے ۵ جنوری ۱۹۷۸ تک نائب وزیراعظم رہے۔ لیکن ان کی ملی سلامت پارٹی پر بھی ۱۹۸۱ میں پابندی لگا دی گئی۔

اربکان نے اس کے بعد ۱۹۸۷ میں "رفاہ (ویلفیئر) پارٹی" بنالی، جس نے جون ۱۹۹۶ کے الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل کی اور اربکان ۲۸ جون ۱۹۹۶ کو ملک کے وزیراعظم بن گئے لیکن جلد ہی ۳۰ جون سنہ ۱۹۹۷ کو فوجی افسران نے ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور اربکان کو منصب سے ہٹا کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اگلے ہی سال ان کی پارٹی پر پابندی بھی عائد کر دی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور پارٹی بنائی جس کا نام تھا "فضیلت پارٹی"۔ یہ پارٹی سنہ ۲۰۰۱ تک قائم رہی۔ پھر اس پارٹی پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے "سعادت پارٹی" بنائی جو ابھی تک موجود ہے۔

ترکی کے موجودہ صدر رجب طیب اردوگان، اربکان کے قریبی پیروکار رہے ہیں۔ اردوگان نے اپنا سیاسی سفر سنہ ۱۹۹۴ میں استنبول کے میئر کے منصب سے شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے اربکان کی پارٹی چھوڑ دی اور سنہ ۲۰۰۱ میں اپنی الگ "جسٹس اینڈ ڈولپمنٹ پارٹی" (اے کے پی) بنا لی۔ یہ پارٹی سنہ ۲۰۰۲ سے تاحال برسراقتدار ہے۔ اس کے نظریات میں اربکان کی پالیسیوں کے اجزاء شامل ہیں مگر اس نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر بعض مقامی اور مغربی طاقتوں کے ساتھ متعدد امور پر مفاہمت بھی کر لی ہے۔

اگرچہ ایک کے بعد ایک اربکان کی کئی پارٹیوں پر پابندیاں لگائی گئیں اور ان کی حکومت کا تختہ بھی پلٹا گیا مگر انہوں نے کبھی فوج یا اپنے سیاسی مخالفین کو ہدف تنقید نہیں بنایا، نہ ہی سڑکوں پر احتجاج کی پالیسی اپنائی۔ جب بھی ان کی پارٹی پر پابندی لگائی گئی تو انہوں نے ایک نئی پارٹی تشکیل دینے کو ترجیح دی۔ آج ان کی "سعادت پارٹی" کے پرچم میں پانچ ستارے ہیں جو اس بات کی طرف

اشارہ کرتے ہیں کہ یہ ان کی اصل اور اول "ملی نظام پارٹی" کی چوتھی نئی شکل ہے۔اس پارٹی کا اپنا ایک عظیم الشان دفتر ہے جس سے متصل ایک خوبصورت مسجد ہے۔ کسی ترکی سیاسی پارٹی کے دفتر کے ساتھ مسجد ہونا ایک ایسی چیز ہے جس کا دو دہائی قبل تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے زمانے کی اس تبدیلی کی ایک اور علامت انقرہ میں دیکھی جہاں قصر صدارت کے پہلو میں ایک وسیع وعریض اور دلکش مسجد زیر تعمیر ہے۔

اپنے پیروکاروں کو اربکان کی تلقین تھی کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی تنظیمیں قائم کریں۔ اس کے نتیجے میں ان کی اصل تنظیم "ملی گوروش" (ملی نظریہ) کی زیر سرپرستی دو درجن سے بھی زیادہ مضبوط تنظیمیں ترکی میں سرگرم ہیں۔ہماری اس کانفرنس کی میزبان "اوگ دیر" (یعنی "فرض شناس اساتذہ کی انجمن") ان میں سے ایک ہے۔مختلف تعلیمی موضوعات پہ یہ تنظیم سالانہ کانفرنسیں گزشتہ چھ سال سے ملک کے درجنوں شہروں میں اس طرح منعقد کرتی ہے کہ مدعو شرکاء مختلف شہروں میں جاکر تنظیم کے مقامی لیڈروں اور دیگر لوگوں سے ملاقاتیں کرسکیں اور شہر کے اہم مقامات کی سیاحت بھی کرسکیں۔

اس بار کانفرنس کا موضوع "نصاب کی کتابوں میں اخلاقیات" تھا۔بالفاظ دیگر مرکز توجہ "تعلیمی نظام میں اقدار کی اہمیت وضرورت" تھا۔ یہ کانفرنسیں اس سال ۵۵/ شہروں میں منعقد ہوئیں جن میں قونیہ، انقرہ اور استنبول شامل تھے۔ان تینوں شہروں کی کانفرنسوں میں، میں نے اپنے ۸/روزہ قیام کے دوران شرکت کی۔ان سبھی کانفرنسوں میں مدعو بیرونی مہمانوں، ترک اساتذہ اور دانشوروں نے خطاب کیا۔بیرونی مہمانوں میں معروف برطانوی صحافیہ لورین بوتھ (سابق وزیراعظم ٹونی بلیر کی اہلیہ کی سوتیلی بہن، جو مشرف بہ اسلام ہوگئی ہیں)، پروفیسر زکریا عثمان (چاڈ) اور شیخ عبدالمعبود (برونئی) شامل تھے۔

انقرہ کے ہوائی اڈے پر مجھے لینے کے لئے کوئی کیب ڈرائیور نہیں بھیجا گیا، جیسا کہ عام طور سے اس طرح کی کانفرنسوں میں ہوتا ہے، بلکہ تنظیم کے ایک کارکن مسٹر شعبان جو ایک مقامی اسکول میں پڑھاتے ہیں، آئے تھے۔ دہلی کے ۲۵/ڈگری سیلسیس کے خوشگوار موسم کے مقابلے یہاں جہاز سے اترتے ہی کپکپانے والی سردی کا سامنا کرنا پڑا۔ درجۂ حرارت ۱۱/ڈگری تھا اور ہوائی اڈے پر بہت کم جہاز نظر آرہے تھے۔

انقرہ (آبادی ۴۵لاکھ) اگرچہ ترکی کا دارالسلطنت ہے مگر استنبول کے مقابلے (آبادی ایک کروڑ

چالیس لاکھ) بہت چھوٹا ہے۔ پہاڑیوں کے ایک سلسلے کے بیچ میں آباد انقرہ ایک خوبصورت شہر ہے۔ استنبول کے برخلاف یہاں کی سڑکوں پر ہجوم بہت کم ہے۔ مساجد بھی کم نظر آئیں۔ یہاں کی مساجد عموماً ایک مینار والی ہیں جب کہ استنبول کی مساجد میں دو مینار عام ہیں۔ استنبول کی طرح یہاں کی رہائشی عمارتوں، دفاتر اور دوکانوں پر چھوٹے بڑے ترکی قومی پرچم آویزاں ہیں۔ یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ اس قوم پرستی کے غیر معمولی اجتماعی مظاہرے کا مقصد کیا ہے؟ کوئی داخلی اندیشہ یا حکومت کی تائید وحمایت کی وجہ سے ایسا کیا جاتا ہے؟

دوسرے دن ہم ایک تیز رفتار اور آرام دہ ٹرین سے قونیہ گئے۔ یہ ٹرین چند ہی منٹ میں ۲۵۰ کلومیٹر کی رفتار پکڑ لیتی ہے۔ کمپارٹمنٹ کی چھت پر لگے ایک ویڈیو اسکرین پر خبروں اور اشتہاروں کے ساتھ ساتھ ٹرین کی گھٹتی بڑھتی رفتار دیکھی جا سکتی ہے۔ ریلوے لائن کے دونوں جانب سرسبز و شاداب پہاڑیاں یا ہرے بھرے کھیت نظر آئے۔ ہمارے راستے میں کئی گاؤں اور قصبے بھی آئے مگر ان میں آدمی چلتے پھرتے بہت کم نظر آئے۔ کھیتوں میں مویشیوں کا بھی نام ونشان نہیں تھا۔

ترک عربی اور فارسی کے بہت سے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً 'لطفن' (براہ کرم)، ساعت (گھنٹہ)، دقیقہ (منٹ)، مسافر، مرکزی، زراعت، دقّت (ملاحظہ ہو!) وغیرہ۔ مصطفٰی کمال پاشا نے جدیدیت کی لاحاصل جھونک میں آکر ۱۹۲۸ میں اچانک ترکی زبان کا رسم الخط عربی سے بدل کر رومن کر دیا تھا۔ لیکن ترکی کا رومن رسم الخط آج بھی ترکی زبان کے بہت سے حروف اور الفاظ کی آواز کی پوری طرح ادائیگی سے قاصر ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ نئی نسلیں ماضی کے ان عظیم ذخائر کتب اور لاکھوں دستاویزات سے یک لخت کٹ گئیں جو عربی رسم الخط میں تحریر ہیں۔ آج ترکی میں بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو لائبریریوں اور میوزیموں میں رکھی ہوئی لاکھوں قدیم کتابوں، مخطوطات کے ذخائر اور محفوظ تاریخی دستاویزات سے استفادہ کر سکیں۔

ترک بہت سے حروف ادا نہیں کر پاتے۔ مثلاً 'د' کو 'ت' سے بدل لیا ہے اس لئے محمد، محمت بن گیا۔ 'خ' کو 'ھ' بولتے ہیں، یوں 'خان' 'ہان' بن گیا اور خانم، ہانم ہو گئیں۔ ترکی زبان کا 'و' بھاری ہوتا ہے اس لئے مولانا کو 'میولانا' بولتے ہیں۔ وہ 'ب' کو 'پ' بولتے ہیں، اس لئے کتاب ان کی بولی میں کتاپ ہو گئی۔ 'ق' کی جگہ 'ک' بولتے ہیں وغیرہ۔ رسم الخط عربی سے بدل کر رومن کر دینے سے بہت سے حروف اور الفاظ کی اصل شکل وصورت محفوظ نہیں رہ سکی۔ اردو اور فارسی زبانیں

بھی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان زبانوں کے بولنے والوں کے لئے بھی بعض حروف کی ادائیگی مشکل ہوتی ہے مگر کم از کم ان کی املا تو درست ہوتی ہے جبکہ ترکی میں بہت سوچنا پڑتا ہے کہ اس کی اصل کیا رہی ہو گی اور ترکی کی نئی نسل بھی بہت سے رائج الفاظ کی اصل سے بے خبر ہے۔ ترکی میں مکانوں کا طرز تعمیر یورپی انداز کا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دونوں خطوں میں مسئلہ بارش اور برفباری کا برابر ہے۔

قونیہ کے اس سفر میں ایک اسکول پرنسپل مسٹر عثمان ہمارے رہبر تھے۔ وہ تھوڑی بہت عربی اور انگریزی جانتے تھے مگر اتنی نہیں کہ ان سے کوئی مفید تبادلۂ خیال ہوسکے۔ ترکی کے علاوہ کوئی زبان عام طور سے یہاں لوگوں کو نہیں آتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبان کے معاملے میں ترک اپنی ہی زبان کو کافی گردانتے ہیں جس کی بدولت غیر ملکی سیاحوں اور مہمانوں کو خاصی دشواری ہوتی ہے۔ عام باشندے، ہوٹل اسٹاف، ٹیکسی ڈرائیور یہاں تک دوکاندار بھی مشکل سے ہی کوئی دوسری زبان سمجھ اور بول سکتے ہیں۔ ایرپورٹ کا محکمہ بھی بہت کم انگریزی بولتا ہے۔ اس کے برخلاف مصر، ایران اور ہندوستان وغیرہ ممالک میں عموماً سیاحت، مہمان نوازی اور تجارت وغیرہ شعبوں سے وابستہ لوگ کام چلانے بھر انگریزی بلکہ کچھ دوسری غیر ملکی زبانیں بھی جانتے ہیں۔

پہلی کانفرنس، جس میں ہماری شرکت ہوئی وہ قونیہ میں ۳۰ مارچ کو منعقد ہوئی۔ اس میں بڑی تعداد میں خواتین اور طلبہ نے شرکت کی۔ تنظیم 'اوگ دیر' کے صدر حمدی سوروکو نے اپنے افتتاحی خطاب میں بتایا کہ ان کانفرنسوں میں ہماری توجہ کا مرکز نصاب میں اصلاحات رہا ہے۔ اس موضوع پر ہماری تنظیم گزشتہ دس سال سے توجہ دے رہی ہے۔ انہوں نے کہا: "ہم اپنے بچوں کے ذہن و قلب میں کیا چیز بٹھاتے ہیں، اس معاملے میں ہمیں محتاط رہنا چاہئے۔ کیونکہ اصل طاقت فوج نہیں بلکہ اصل طاقت افکار و نظریات سے توانائی پانے والے ہمارے بچے ہیں"۔

میں اس کانفرنس کا پہلا مقرر تھا اور میں نے اقدار پر مبنی تعلیم پر مشرق اور مغرب کا تاریخی پس منظر پیش کیا اور اس کے حوالے سے اسلامی نقطۂ نظر سے نصاب میں مطلوب اصلاحات پر اظہار خیال کیا۔

سعادت پارٹی قونیہ کے سربراہ حسن حسین اویار نے کہا: ہمیں صرف آئندہ دس سالہ کے لئے نہیں بلکہ آئندہ سو سال کے بارے میں غور و فکر کرنا ہے۔ انہوں نے نجم الدین اربکان مرحوم کی وہ نصیحت یاد دلائی جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کی تھی اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ

تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم دوسری یالٹا کانفرنس منعقد کرو۔ اس وقت دنیا کی ۹۹ فیصد آبادی جن مشکلات اور بحرانوں سے دوچار ہے وہ پہلی یالٹا کانفرنس[1] کے مابعد اثرات کا ہی نتیجہ ہیں۔

ترک اسکالر پروفیسر ایم نظیر گل نے چند نفری خاندانوں کے بچوں کے اندر پیدا ہو جانے والی خرابیوں کو موضوع بنایا۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ ماحول یہ ہے بچے کی ہر خواہش کو برتری اور فوقیت حاصل ہے۔ ایسے ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کو آئندہ زندگی میں مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا۔ حد یہ ہے ہر چیز کا تعین بچوں کی خواہشات کے مطابق ہونے لگا ہے: کونسا چینل دیکھا جائے، کیا کھایا جائے، چھٹیوں میں کہاں جایا جائے؟ وغیرہ۔ یہ بچے طے کرتے ہیں اور وہ سب سے بہتر کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ لیکن جب یہی بچے عملی زندگی میں آئیں گے اور کسی کام دھندے میں لگیں گے، شادی کریں گے، تب ان کو ان عادتوں کی وجہ سے نفسیاتی دشواریاں لاحق ہوں گی۔ اس وقت ترکی میں شادی کی اوسط عمر ۲۵ سال یا اس سے زیادہ ہے۔ اب کیونکہ نئے جوڑے یہ جانتے ہی نہیں کہ بچوں کی پرورش کس طرح ہو، طلاق کی شرح بڑھ رہی ہے۔ عموماً فی خاندان ایک یا دو بچے ہوتے ہیں۔ والدین اپنے بچوں کے لئے آسانی سے وہ سب فراہم کرا دیتے ہیں جس کا مطالبہ بچے کرتے ہیں۔ اس طرح بچوں کی تربیت اور پرورش غلط طریقے سے ہو رہی ہے۔ بچوں کی ضد پورا کرنے والی ہر ماں کی دلیل ہوتی ہے کہ اسلام رحم دلی کی تعلیم دیتا ہے، اس لئے ہم بچوں کے ساتھ سختی نہیں برت سکتے۔ پروفیسر گل نے کہا کہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان یا سب سے چھوٹی اولاد اور دیگر بچوں کے درمیان کوئی تفریق یا امتیاز نہیں برتا جانا چاہئے۔ والدین کو معلوم ہونا چاہئے کب بچے کے کس مطالبے کو منع کر دینا چاہئے۔ اگر آپ کام کر رہے ہیں اور اس وقت بچہ کھیلنا چاہتا ہے، تو آپ میں اتنا حوصلہ اور سوجھ بوجھ ہونی چاہئے کہ آپ اس کو منع کر سکیں اور وہ مان جائے۔

پروفیسر زکریا عثمان نے کہا کہ افریقہ پر چھ استعماری طاقتوں نے اپنے سامراجی شکنجے کسے تھے: پرتگالی،، فرانسیسی، ہسپانوی، جرمن، اطالوی اور برطانوی۔ سامراجی نظام کے مسلط ہونے سے پہلے افریقہ صرف اور صرف اسلام سے واقف تھا۔ مسلسل پیدا ہونے والی کمزوریوں اور ان کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ کی پے درپے شکستوں نے سامراجی طاقتوں کے لئے افریقہ کے دروازے کھول دیے

---

[1] یالٹا کانفرنس ۴۔۱۱ فروری ۱۹۴۵ کے دوران یالٹا (قرم، روس) میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں دوسری جنگ عظیم میں فاتح "حلیف" قوموں کے سربراہ (روسی ڈکٹیر سٹالن، برطانوی وزیر اعظم چرچل اور امریکی صدر روزولٹ) شریک ہوئے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا۔

یہاں تک کہ وہ افریقہ پر مسلط ہو گئے۔

مسز لورین بوتھ نے اپنے سفر قبولیتِ اسلام پر اظہار خیال کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ یورپی تہذیب اور طرز حیات میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھیں کہ ان کے قبول اسلام کا ہرگز کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن اپنے صحافتی پیشے کے تحت انہوں نے سنہ ۲۰۰۸ میں غزہ کا سفر کیا جس نے ان کو بدل ڈالا اور وہ رفتہ رفتہ اسلام کی طرف متوجہ ہونے لگیں۔ انہوں نے یوروپ کے اخلاقی انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سنہ ۲۰۱۶ کے ایک امریکی سروے کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکا میں ہر چھ میں سے ایک خاتون جبری عصمت دری کا شکار ہوتی ہے۔ یوروپ جس اخلاقی نظریے کے تحت آگے بڑھ رہا ہے وہ یہ ہے: تم کو جو کچھ اچھا لگتا ہے، اس کو کر ڈالو۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، اس لئے جو کچھ دل چاہے کر لو۔ انہوں نے کہا کہ ٹی وی چینلز بھی بچوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ بچے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ دکھایا جا رہا ہے، وہ حقیقت ہے۔ وہ خود غرضی سکھاتے ہیں۔ وہ یہ سکھاتے ہیں کہ دوسرے سے انسیت و محبت مت کرو۔ کسی غلط بات پر ٹیچر بچے کی سرزنش نہیں کر سکتا۔ ایک اجنبی شخص روتے ہوئے بچے کو چھو نہیں سکتا، اگر وہ اظہار ہمدردی کرتا ہے تو پولیس بلالی جاتی ہے۔

دوسرے دن صبح کے چند گھنٹے ہم نے قونیہ کی سیاحت میں گزارے۔ اس شہر میں عظیم صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی معروف بہ "مولانا روم" کا مدفن ہے جو مرجع خلائق ہے۔ فطری طور سے ہمارا زیادہ وقت ان کی خانقاہ میں گزرا جس میں ان کے اور ان کے بہت سے رشتہ داروں اور مریدوں کے مزارات ہیں۔ اس میں ایک خوبصورت میوزیم بھی بنایا گیا ہے جس میں اس عظیم پیر طریقت کے طریقۂ تعلیم و تربیت کو دکھایا گیا ہے۔ وہ تعلیم، تربیت اور تزکیہ کے بعد اپنے مریدین کو دور دراز علاقوں میں دین کی تعلیم و تبلیغ کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ خانقاہ ایک وسیع احاطے میں واقع ہے جس کے گرد و پیش باغ ہیں اور ایک بلند بالا عمارت ہے۔ اسی عمارت میں واقع مرکزی مزار خود مولانا روم کا ہے۔ کئی بڑے کمرے ہیں، باورچی خانہ ہے، درس گاہ ہے، مسجد ہے۔ ان سب عمارتوں کو اچھی طرح محفوظ رکھا گیا ہے۔ سیاحوں کو ریموٹ کنٹرول کا ایک الیکٹرانک آلہ دیا جاتا ہے جس میں سلیکشن پینل ہوتا ہے۔ میوزیم کے کسی بھی حصہ پر لگے پینل کا بٹن دبا کر اس حصے کی تفصیل سن لیجئے۔ یہ سہولت کئی زبانوں میں دستیاب ہے۔ اسی دن شام کو ہم فاسٹ ٹرین سے انقرہ واپس لوٹ آئے۔

انقرہ میں دوسرے دن منعقدہ کانفرنس میں "اوگ دیر" کے قومی صدر حمدی سورو کو نے تعارفی کلمات میں وضاحت کی کہ اس سال ہمارا مرکزِ توجہ باہر سے درآمد کیا ہوا نصاب تعلیم ہے۔ ہم اس مسئلے کو قومی ایجنڈے میں شامل کرانے اور اس کا حل تجویز کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ انہوں نے

کہا کہ ہم اس سال اپنی زندگیوں میں "حلال" کی تحقیق کر رہے ہیں، صرف کھانے پینے میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی۔ ہم یہ باتیں اساتذہ اور طلبہ کو سکھانا چاہتے ہیں جو قومی زندگی میں تبدیلی لائیں گے۔ ہم دیگر ممالک میں اپنے بھائیوں سے رابطوں کے لئے بھی کوشاں ہیں۔

لورین بوتھ نے کہا کہ جب وہ استنبول پہنچیں تو حیران ہوئیں۔ انہوں خیال کیا کہ یہ کوئی مسلم ملک نہیں ہے۔ لیکن جب شہر کے اندرونی حصوں سے ہو کر گزریں تو ترکی کے بارے میں ان کا نظریہ تبدیل ہو گیا۔ لوگ اسلام پر پختگی سے قائم ہیں۔ اکثر خواتین حجاب میں نظر آئیں۔ انہوں نے کہا کہ ترکی کے پورے سفر کے دوران انہوں نے بمشکل دس خواتین کو سگریٹ نوشی کرتے ہوئے دیکھا۔

سعادت پارٹی کے قومی صدر مصطفیٰ کمالک نے کہا کہ نام نہاد "عرب بہار" کے بعد امریکا نے ترقی پذیر ممالک کو زیادہ مقدار میں اسلحے فروخت کئے تاکہ وہ ایک دوسرے کو مارتے رہیں۔ اس دوران ہمارے ممالک کمزور ہو گئے چنانچہ ہم پہلے کے مقابلے میں اب مغربی ممالک کے زیادہ دباؤ میں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت آدھی دنیا کے پاس جتنی دولت ہے اس سے زیادہ دولت دنیا کے صرف ۲۲، افراد کے ہاتھوں میں جمع ہے۔ یہ صورتحال ناقابل قبول ہے۔ لیکن اس کو درست کون کرے گا؟ صرف مسلمان ہی اس صورت حال کو درست کر سکتے ہیں۔ ہمارے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو خود تو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔ آج دنیامیں تقریباً نصف ارب لوگوں کی یومیہ آمدنی ایک ڈالر سے بھی کم ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ بھوکے سوتے ہیں۔ ہر چھ منٹ میں دنیا کے کسی کونے میں ایک بچہ بھوک سے یا علاج نہ ہونے سے مر جاتا ہے۔ اس سب کے لئے آخر کون ذمے دار ہے؟

وقفۂ سوالات میں ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا ترکی کو پھر سلطنت عثمانیہ کے دور میں لوٹ جانا چاہئے؟ میں نے جواب دیا آج کے دور میں سلطنت عثمانیہ کے احیاء کا نظریہ مفید اور قابل عمل نہیں ہے۔ آپ کو دورِ عثمانیہ کی وراثت پر فخر کرنا چاہئے لیکن موجودہ دور کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اپنے لئے ایک جدید ریاست اور سیاست کا نمونہ تراشیے۔ میں نے دیکھا کہ کانفرنس ہال میں نصف سے زیادہ خواتین سامعین تھیں۔

انقرہ میں قیام کے دوران ہم نے ایک اسلامی اسکول دیکھا جس کو ایک معمر خاتون چلاتی ہیں۔ ان کو اپنی عثمانی وراثت پر بڑا فخر ہے۔ ان کا اسکول وہ واحد جگہ تھی جہاں کمال اتاترک کے فوٹو اور مجسمے نظر نہیں آئے۔ اس نہایت صاف ستھرے اور چست و درست اسکول میں بعض غیر ممالک کے بچے بھی زیر تعلیم ہیں۔ ان میں صومالیہ جیسے دور دراز ملک کا بھی ایک طالب علم تھا۔ اسکول کی

ایک دیوار پر علامہ سعید نورسی (۱۸۷۷۔۱۹۶۰) کا یہ قول کندہ دیکھا: ”جہنم غیر ضروری نہیں اور جنت سستی نہیں“۔ پرائمری، مڈل، اور انٹر کلاسوں کے مشاہدے کے بعد اسکول کی مالکہ کے گھر ”عثمانیہ منزل“ میں ہماری عثمانی ظہرانے سے ضیافت کی گئی جس میں سرخ رنگ کا ایک خاص سوپ بھی شامل تھا جو عثمانی افواج کو فوجی مہمات کے دوران پلایا جاتا تھا۔

یکم اپریل کو ہم طیارے سے استنبول گئے۔ اس شہر میں دو بڑے ہوائی اڈے ہیں اور دونوں بے حد مصروف۔ ترکی اب استنبول کے پاس ایک اور طیران گاہ بنا رہا ہے جو یوروپ میں موجود ہر ہوائی اڈے سے بڑا ہوگا۔ اس سے ابھی سے بعض یورپی ممالک کی نیند حرام ہو رہی ہے کیونکہ اس کے کھل جانے سے ان کی ہوائی ٹریفک کم ہو جائے گی۔ ٹرکش ایرلائنز، جو ایک زمانے میں ہماری ایر انڈیا کی طرح بیمار اور خسارے میں چلنے والی کمپنی تھی، اردوگان حکومت میں اس کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ اب وہ دنیا کی کامیاب ترین ایرلائنز میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ایرلائن روز بروز مزید مقامات کے لئے سروسیں شروع کر رہی ہے۔ اس کو لگاتار پانچ سال تک یورپ کی سب سے کامیاب ایرلائن منتخب کیا گیا۔ ٹرکش ایرلائنز سے سفر کرنا ہمیشہ بہت خوش کن اور اطمینان بخش ہوتا ہے۔ اس کے طیارے نہایت صاف ستھرے اور عملہ بہت خلیق اور متواضع ہے۔

دوسرے دن ہم نے عظیم الشان سلطان فاتح مسجد دیکھی جسے یورپین 'نیلی مسجد' Blue Mosque کہتے ہیں کیونکہ اس مسجد کے اندر نیلے رنگ کے ٹائلز استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ مسجد فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد دوم نے تعمیر کرائی تھی۔ فتح قسطنطنیہ سنہ ۱۴۵۳ء میں عمل میں آیا۔ عیسائی بڑے فخر کے ساتھ کہتے تھے کہ ”ہاگیا صوفیا“ چرچ کا گنبد دنیا میں سب سے بڑا ہے۔ سلطان نے حکم دیا کہ مسجد کا گنبد ہاگیا صوفیا کے گنبد سے بھی بڑا ہو جو اس مسجد کے قریب ہی واقع ہے۔

اس کے بعد ہم ہاگیا صوفیا چرچ دیکھنے گئے جو فتح قسطنطنیہ کے موقع پر ۲۹ مئی ۱۴۵۳ سے ایک مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا لیکن مصطفی کمال نے سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد ۱۹۳۱ میں اس کو بند کرا دیا۔ یکم فروری ۱۹۳۵ کو اسے پھر کھول دیا گیا مگر عبادت گاہ کے بجائے ایک میوزیم کے طور پر۔ یہ اب بھی ایک میوزیم ہے جو چرچ کی عظمت اور ترکی میں بازنطینی دور حکمرانی کی شان کا مظہر ہے [۲]۔ اگرچہ اب اس میں عیسائی دعائیہ مجلسیں نہیں ہوتیں، مگر ہم نے ایک خاتون کو پہلی منزل

---

[۲] جولائی ۲۰۲۰ میں ترکی حکومت نے اس میوزم کو دوبارہ مسجد میں تبدیل کر دیا۔ ترکی حکومت نے اپنے فیصلے میں کہا کہ یہ مسجد سلطان محمد نے وقف کی تھی، اس لئے اس کی حیثیت بدلنا جائز نہیں تھا۔ اس فیصلے کے باوجود مسجد کے اندر واقع

پر، جہاں کسی زمانے میں عبادت گاہ تھی، حضرت بی بی مریم، حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام اور حضرت یحییٰؑ کے مجسموں کے سامنے مناجات کرتے ہوئے دیکھا اور کسی نے اس کے جذبۂ عقیدت مندی میں مداخلت نہیں کی۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے مسجد قرطبہ کا منظر یاد آگیا جہاں میں سنہ ۲۰۰۸ میں گیا تھا۔ یہ دنیا میں شاید سب سے عظیم اور وسیع مسجد ہے۔ اب اس کے اندر ایک درجن سے بھی زیادہ چرچ ہیں۔ سابق مسجد کے باہر دروازے پر ایک نوٹس بورڈ آویزاں ہے جس پر چرچ میں دعا و مناجات کے اوقات درج ہیں لیکن مسلمانوں کو اس مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ داخلے کے لئے بھاری بھرکم رقم دے کر جیسے ہی کوئی مسلمان اندر داخل ہوتا ہے تو گارڈ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو جبراً روک دیتے ہیں۔

ہماری اگلی منزل دولما باغچہ پیلیس تھا جو آخری عثمان سلاطین کا صدر مقام اور رہائش گاہ تھا۔ اس کی تعمیر سلطان عبدالمجید نے سنہ ۱۸۵۶ میں کرائی تھی۔ وہ ۱۸۳۱ سے ۱۸۶۱ تک حکمراں رہے۔ اس کی تعمیر میں پانچ ملین عثمانی لیرا (۳۵ /ٹن سونا) کی لاگت آئی تھی جو آج کے لحاظ سے تقریباً دو بلین ڈالر کے برابر ہے۔ آبنائے باسفورس کے کنارے واقع یہ وسیع و عریض محل ۵۹۵ء۱۴ مربع میل (۱،۱۱/ ایکڑ) پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ۲۸۵ کمرے، ۴۴ بڑے ہال، ۶۸ بیت الخلاء، اور چھ ترکی وضع کے بڑے حمام (غسل خانے) ہیں۔ الٹے ایل (L) کی شکل میں تعمیر شدہ یہ عمارت سلطان عبدالمجید کے بعد آنے والے تمام سلاطین کا صدر مقام رہی۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد کمال اتاترک اور ان کے جانشین عصمت انونو بھی سنہ ۱۹۴۹ تک اسی محل سے حکومت کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۸۴ میں اس کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا اور عوام کے لئے کھول دیا گیا۔ ہمارے ترک رہبر کا اس میوزیم کے ایک اعلا افسر سے رابطہ تھا جنھوں نے اس کے گیٹ پر ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمیں ایک سرکاری گائڈ فراہم کر دیا جس نے ہمارے لئے میوزیم کے وہ حصے بھی کھلوا دیے جو عام طور سے سیاحوں کے لئے نہیں کھولے جاتے ہیں۔

اس وسیع و عریض کمپلکس کے اُس حصے کی شان و شوکت، جو سرکاری مقاصد کے لئے استعمال ہوتا تھا، آج بھی برقرار ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ حصہ، جو سلاطین کے رہائشی استعمال کے لئے تھا، نہایت سادہ ہے۔ رہائشی حصے میں ساز و سامان کفایت کے ساتھ اور معمولی لگا ہوا ہے، جو اس بات کی گواہی دیتا ہے، ترک سلاطین اپنی ذاتی زندگیوں میں کس قدر سادگی پسند تھے۔ ہم نے وہ کمرہ بھی دیکھا جس میں نومبر سنہ ۱۹۳۸ میں اتاترک نے زندگی کی آخری سانس لی اگرچہ غیر مصدقہ طور

آثار اپنی جگہ باقی ہیں اور نماز کے اوقات کے باہر یہ مسجد زائرین کے لئے کھلی رہتی ہے۔

سے کہا جاتا ہے ان کی موت ایک کشتی پر ہوئی تھی اور بعد میں ان کے جسد خاکی کو یہاں لایا گیا۔ ہم نے وہ لفٹ بھی دیکھی جو اتاترک کے لئے اس لئے لگوائی گئی تھی کہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں جگر کی سیر وسس (سکڑن) کے مہلک مرض میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے وہ سیڑھیوں سے چڑھ اتر نہیں سکتے تھے۔ ہم نے وہ کمرہ بھی دیکھا جس میں سلاطین اپنے خاندان کے ساتھ عید مناتے تھے۔ ہمارے گائڈ نے ہمیں بتایا کہ سلطنت عثمانیہ کے سقوط کے بعد آخری حکمراں سلطان عبدالعزیز کو سرکاری رہائش گاہ چھوڑ دینے اور ترکی کی حدود سے نکل جانے کے لئے صرف چار گھنٹے دیے گئے تھے۔ اسی آخری سلطان کی بیٹی درّ شہوار سے نظام حیدر آباد کے بیٹے اعظم جاہ کی ۱۹۳۱ میں شادی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں مکرم جاہ اور مفخم جاہ کی پیدائش ہوئی تھی۔

دوسرے دن ہم نے اناطولین یوتھ آرگنائزیشن کا صدر دفتر دیکھا۔ یہ تنظیم بھی 'ملی گورش' خاندان کا ایک حصہ ہے۔ اس کی شاخیں کئی ممالک میں ہیں۔ تنظیم کے چیرمین صالح ترہان کی قیادت میں تنظیم کے متعدد ممبران نے ہمارا استقبال کیا۔ مسٹر ترہان نے ہمیں بتایا کہ اربکان کہا کرتے تھے کہ ''تمہارے پاس اگر اعلیٰ ڈگریاں ہیں اور تم نوبیل انعام بھی حاصل کرلو تب بھی یہ سب بے معنی ہے اگر تمہارے عوام بھوک سے مر رہے ہیں''۔ مسٹر ترہان نے بتایا کہ جب اربکان نے قونیہ میں اپنی پہلی سیاسی ریلی منعقد کی تو اس میں غیر متوقع طور پر ہزارہا افراد نے شرکت کی تھی۔ اس پر اس وقت کے وزیر اعظم سلیمان دیمیریل نے کہا تھا: ''ایک پھول کھل جانے سے بہار نہیں آجاتی''۔ اس کے جواب میں اربکان نے کہا تھا: ''بہار کا آغاز ایک پھول کے کھلنے سے ہی ہوتا ہے''۔

ہم نے ملی گورش کے ترجمان روزنامہ ''ملّی گزیتہ'' کا دفتر بھی دیکھا۔ اس کے انقرہ بیوریو کے چیف مصطفیٰ یلماز نے بتایا کہ سنہ ۱۹۸۰ میں صرف آٹھ دن کے ناغے کے علاوہ ترکی زبان میں نکلنے والا یہ اخبار گزشتہ ۴۵ برس سے پابندی سے نکل رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پیش نظر مسلم مسائل کو ترک اور عالمی ایجنڈے پر رکھنا ہے۔

ہم انقرہ میں اوگ دیر تنظیم کے صدر دفتر بھی گئے جہاں تنظیم کے قومی اور ریاستی سطح کے لیڈروں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کی ترکی پر جبراً مسلط کردہ سیکولر نظام نے ترک عوام کی اخلاقی و دینی اقدار کو ان سے چھین لیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۳ سے سنہ ۱۹۴۸ تک ملک میں اسلام پر پابندی عائد رہی۔ اس دوران تمام اسلامی مدارس اور دیگر ادارے بند کردیے گئے تھے۔ صورت حال اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ سنہ ۱۹۴۸ آتے آتے تربیت یافتہ ائمۂ مساجد بھی ملنے دشوار ہو گئے تھے۔ اس دوران معمولی صلاحیت کے افراد اپنے حسب لیاقت بچوں کو تھوڑا بہت دین

اور قرآن پڑھا دیتے تھے۔ اسی کے بعد اماموں کی تربیت کے لئے "امام-خطیب" مدرسے کھولے گئے۔ سنہ ۱۹۵۰ میں جب ترکی نے ناٹو کی تنظیم میں شرکت کی درخواست دی تو اس کو بتایا گیا کہ ملک میں ایک پارٹی نظام نہیں چلے گا۔ اس کے بعد ہی کثیر پارٹی نظام رائج ہوا۔ اگرچہ مصطفی کمال کی قائم کردہ "ریپبلکن پارٹی" آج بھی موجود ہے، لیکن وہ اپنی اصل صورت سے کافی حد تک مختلف ہے۔ عوامی دباؤ نے حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ قدم بقدم سیاسی اصلاحات نافذ کرے۔

ڈیموکریٹک پارٹی نے سنہ ۱۹۵۰ میں عدنان میندریس کی سربراہی میں الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے اذان کو ترکی سے پھر عربی میں رائج کیا۔ اسی سال اسلامی مدرسوں کو کچھ سہولتیں دی گئیں۔ انہوں نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ عوام کو عوامی زندگی میں اسلام کو واپس لانے کا حق ہے۔ ان اقدامات سے مغربی ممالک فکرمند ہو گئے۔ انہوں نے سازباز سے فوج کے ذریعے ۲۷ مئی سنہ ۱۹۶۰ کو میندریس کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ میندریس پر ان کی پارٹی کے دیگر لیڈروں کے ساتھ فوجی عدالت میں مقدمہ چلا جس نے میندریس سمیت تین لیڈروں کو آئین کی خلاف ورزی کے الزام میں موت کی سزا سنائی۔ تینوں کو ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۶۱ کو پھانسی دیدی گئی۔ اس طرح میندریس تاریخ میں پہلے وزیراعظم بن گئے جن کو ان کے ملک میں پھانسی دی گئی۔

اس دوران نجم الدین اربکان بحیثیت انجینئر ترکی کے پرانے ٹینکوں کی مرمّت کے لئے جرمنی میں مقیم تھے۔ اربکان نے ترکی کو ایک صنعتی ملک بنانے کے لئے وزیراعظم میندریس کو ایک منصوبہ بھیجا جس کو انہوں نے پسند کیا۔ چنانچہ اس کا آغاز ایک کار فیکٹری سے ہوا، جس کا ڈیزائن خود اربکان نے تیار کیا تھا۔ اربکان نے اپنے ولولہ انگیز منصوبے پر تقریباً دو سو فوجی جنرلوں سے بھی بات کی۔ مغربی ممالک نے بھانپ لیا کہ ترکی کو ایک صنعتی ملک بنانے کے پروگرام کے پس پشت دراصل میندریس ہی ہیں جب کہ یہ ممالک کسی بھی مسلم ملک کو بڑی صنعتیں نہیں لگانے دیتے تھے۔ صنعتوں پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے مغربی ممالک نے مصر کے حکمراں محمد علی کو انیسویں صدی کے وسط میں مجبور کر دیا تھا کہ وہ صنعتوں کے بڑے منصوبے کو ترک کر دیں۔

مغرب کی سازش سے ہونے والی فوجی بغاوت کے بعد ڈیموکریٹک پارٹی پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ اربکان نے میندریس کو سزائے موت سے بچانے کے لئے بھرپور جدوجہد کی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ سرکاری مدد نہ ملنے کی وجہ سے ان کی ڈیزائین کی ہوئی کار فیکٹری کا منصوبہ بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ "جی یو ایس" نام سے یہ فیکٹری اب بھی موجود ہے مگر اس میں زراعت کے کچھ آلات بنائے جاتے ہیں۔ سزائے موت کے ۲۹ برس بعد ۱۹۹۰ میں ترک پارلیمنٹ نے عدنان میندریس کو ضابطہ شکنی کے تمام الزامات سے بری کر دیا۔

اس کے بعد ۱۹۶۵ میں الیکشن ہوئے مگر کسی پارٹی کو واضح اکثریت نہیں ملی۔ چنانچہ ایک متحدہ سرکار بنی جس میں انجینئر سلیمان دیمیریل وزیراعظم مقرر ہوئے۔ اربکان نے وزیراعظم دیمیریل کو بعض اصلاحات کے لئے اور اسلامی سرگرمیوں پر سے کچھ پابندیاں ہٹانے کے لئے آمادہ کرنا چاہا لیکن انھیں کامیابی نہیں ملی۔ اس وقت اربکان نے ایک تنظیم قائم کی جس کا نام "شعور" رکھا۔ اس تنظیم نے اسلامی بیداری کی مہم شروع کی۔ اربکان کو یونین آف چیمبرز کا پہلا جنرل سیکریٹری اور پھر سنہ ۱۹۶۹ میں چیئرمین چن لیا گیا۔ وہ چاہتے تھے کہ یونین کے مالی وسائل سے اناطولیہ میں صنعتیں قائم کی جائیں لیکن دیمیریل نے ان کی تجویز کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ ان کو برطرف بھی کر دیا۔

اربکان نے اب محسوس کیا کہ ان کے منصوبے سیاست میں حصہ لئے بغیر کامیاب نہیں ہونگے۔ چنانچہ انہوں نے جسٹس پارٹی میں شمولیت چاہی مگر اس کے لیڈر دیمیریل نے ان کی درخواست کو اپنے اختیار خصوصی سے مسترد کر دیا۔ چنانچہ اربکان نے قونیہ سے سنہ ۱۹۶۹ میں ایک آزاد امیدوار کے طور پر الیکشن لڑا اور ان کو اتنے ووٹ ملے جو تین ممبران پارلیمنٹ کو منتخب کرنے کے لئے کافی تھے۔ سنہ ۱۹۷۰ میں انہوں نے اپنی "ملی نظام پارٹی" بنائی لیکن اس کو حکومت نے "سیکولرزم کی خلاف ورزی" کے الزام میں اگلے ہی سال کالعدم کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے سنہ ۱۹۷۲ میں "ملی سلامت پارٹی" بنائی اور سنہ ۱۹۷۳ و سنہ ۱۹۷۷ کے انتخابات جیتے۔ ان کی "ملی سلامت پارٹی" پر بھی سنہ ۱۹۸۱ میں پابندی عائد کر دی گئی اور اس کے لیڈروں کو قید کر دیا گیا۔ تب انہوں نے سنہ ۱۹۸۷ میں "رفاہ پارٹی" بنائی۔ اس دوران اربکان نے ۲۸ جون ۱۹۹۶ کو وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا۔

اربکان کی قیادت میں ترکی نے داخلی اور خارجی محاذ پر کئی نئی پالیسیاں نافذ کیں۔ لیکن فوج کے دباؤ میں ان کو ۲۸ فروری سنہ ۱۹۹۷ کو وزیراعظم کا منصب چھوڑ دینا پڑا۔ جلد ہی ان کے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر بھی پابندی لگا دی گئی اور اگلے ہی سال ان کی رفاہ پارٹی پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ ان کے ساتھیوں نے اسی سال فضیلت پارٹی کی بنیاد رکھ دی لیکن اس پر بھی ۲۰۰۱ میں پابندی لگا دی گئی۔ اب ان کے ساتھیوں نے سنہ ۲۰۰۳ میں "سعادت پارٹی" بنالی جو اب بھی موجود ہے۔ پارٹی کے لیڈروں نے ہمیں بتایا کہ سیاسی پارٹیوں اور سرگرمیوں پر پابندیوں کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔

اربکان کے پیش نظر وسیع اصلاحات تھیں۔ اسی لئے انہوں نے سنہ ۱۹۶۹ میں "ملی گوروش" تنظیم قائم کی تھی۔ بعد میں اسی کے بطن سے متعدد دیگر تنظیمیں وجود میں آئیں جو ان کے پیروکاروں

نے قائم کیں ۔ ملی گوروش کا نعرہ ہے "روحانیت بمقابلہ مادیت"۔ اربکان کا پہلا نعرہ تھا: "اخلاق و معنویت" (اخلاق اور روحانیت) ۔انہوں نے یورپی یونین کے مقابلے میں اسلامی یونین کا تصور پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا جب تک اتحاد نہیں ہو گا، مسلمانوں کو دنیا کے اجالے میں انصاف نہیں ملے گا۔ انہوں نے کاشتکاروں، کامگاروں اور قوم کو منظم کرنے کے لئے مختلف نوعیت کی تنظیمیں قائم کیں جو اپنے اپنے دائرے میں آج بھی سرگرم ہیں۔ انہوں نے مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی اور روحانی بالیدگی کا دامن جوڑا۔ وہ کہا کرتے تھے: "ہمیں نام کے عام مسلمان درکار نہیں، ہمیں حقیقی معنوں میں مسلمانوں کی ضرورت ہے"۔

سعادت پارٹی کے ذمے داران نے ہم کو بتایا کہ مراکش کے کچھ نوجوان لیڈر ترکی آئے۔ان کو اربکان کے تنظیموں میں تربیت دی گئی۔ وہ اب مراکش پر حکومت کر رہے ہیں[۴]۔ جب اربکان وزیر اعظم تھے تو انہوں نے بڑے مسلم ممالک کو ساتھ لانے کے لئے ،جن میں سے ہر ایک کی آبادی چھ کروڑ یا اس سے زیادہ تھی، ایک تنظیم "ڈی-۸" بنائی۔ ان کا حتمی نشانہ عالمی امن کے قیام کے لئے دوسری یالٹا کانفرنس منعقد کرنے کا تھا۔

جب اربکان پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی پابندی لگی تو رضائی کوتان پارٹی کے سربراہ چنے گئے۔ کوتان نے دس سال تک فضیلت اور سعادت پارٹیوں کی سربراہی کی۔ بعد میں اپنی ضعیفی کی وجہ سے انہوں نے یہ مناصب چھوڑ دیے لیکن وہ اب بھی پارٹی کے نظریاتی ادارہ "اقتصادی وسماجی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" (ای ایس اے ام) کے سربراہ ہیں۔ ہم نے ان کے دفتر میں ان سے ملاقات کی۔

کوتان کی سربراہی میں "ای ایس اے ام" کا قیام سنہ ۱۹۶۹ میں عمل میں آیا۔ یہ ایک طرح کا تھنک ٹینک (غور و فکر کا ادارہ) ہے۔ جس وقت یہ قائم ہوا تو وہ ترکی میں اپنے طرز کا پہلا ادارہ تھا۔ یہ ادارہ ہر سال مئی کے آخر میں ایک بین اقوامی کانفرنس منعقد کرتا ہے جس میں ساٹھ سے زیادہ ممالک سے لیڈران اور ماہرین حصہ لیتے ہیں۔ اربکان کی طرح کوتان بھی پیشے سے انجینئر ہیں اور وہ اربکان کے اولین ہم نوا اور ساتھیوں میں سے ہیں۔ جب اربکان ملک کے وزیر اعظم بنے تو کوتان نے وزیر توانائی کی حیثیت سے ملک کی خدمت انجام دی۔

---

[۴] یہ حزب العدالۃ والتنمیۃ (جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی) کی طرف اشارہ ہے جس نے ۲۰۱۱ سے ۲۰۲۱ کے درمیان مراکش میں حکومت کی۔

ہم "ملی گوروش" کی ایک دوسری تنظیم "انسٹی ٹیوشنل یوتھ فورم" کے صدر دفتر بھی گئے۔ اس فورم کا قیام سنہ ۲۰۰۵ میں نوجوانوں کی ایک بین اقوامی کانفرنس کے موقع پر ہوا۔ یہ فورم دنیا بھر کے مسلم نوجوانوں کو درپیش مسائل پر ہر سال ایک بین اقوامی کانفرنس منعقد کرتی ہے۔ اس کا اصل کام مسلم نوجوانوں میں باہم رابطہ قائم کرنا اور غیر ملکی طلبہ کو تعلیم کے لئے ترکی لے آنا ہے۔ اس وقت ترکی میں ۸ہزار سے زیادہ غیر ملکی طلبہ ہیں اور ترکی ہر سال پانچ ہزار وظیفے غیر ملکی طلبہ کو دیتا ہے۔

اس سفر کے دوران ہم بہت سے ہندستانی طالب علموں سے بھی ملے جو ترکی کی مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ صرف قونیہ میں ہی تیس ہندستانی طلبہ پی.جی یا پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ بنگلہ دیش، پاکستان وغیرہ دیگر ممالک کے طلبہ بھی یہاں زیر تعلیم ہیں۔ پہلے ایک سال ان کو ترکی زبان سکھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کا اصل تعلیمی کورس شروع ہوتا ہے۔ محمد موسٰی بودک اس فورم کے موجودہ صدر ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم دنیا بھر میں مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ رویے کے خواہش مند ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں: توازن کو کس نے بگاڑا؟ اور وہ خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں: بیشک سامراجی طاقتوں نے۔ ہم مسلمانوں اور دیگر دبی کچلی مظلوم عوام میں اتحاد قائم کر کے اس استحصال کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر ملک کو اپنی زبان کی حفاظت میں مستعد ہونا چاہئے لیکن ہماری ایک مشترکہ زبان بھی ہونی چاہئے جو ہمیں آپس میں جوڑے جو کہ عربی ہے جس سے مسلمان قرآن اور سنت کو سمجھ سکیں۔ اس طرح ایک مضبوط ترکی جس طرح چاہتا ہے کام کر سکے گا اور اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکے گا۔ ہماری منشا ہے کہ ہر رنگ و نسل اور قومیت کا ہر باشندہ عزت اور وقار کے ساتھ جی سکے۔ اس لئے ہمیں دنیا میں منصفانہ نظام قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ یہ تبدیلی، دولت کی منصفانہ تقسیم سے ہی وجود میں آئے گی۔

ہم سعادت پارٹی کے صدر دفتر بھی گئے۔ پارٹی کے قومی صدر مصطفٰی کمالک اور ان کے معاونین نے ہمارا پرجوش خیر مقدم کیا۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ جو کام بھی دوسرے کو نقصان پہنچائے وہ حرام ہے۔ ایک ذی شعور اور صاحب فراست ہرگز کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یورپین یونین میں شمولیت کے لئے ترکی کے عزائم کے بارے میں اپنی پارٹی کے موقف سے متعلق ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا: "ہم کسی ملک یا قوم کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن ہم ایک اسلامی اتحاد کے خواہاں ہیں۔ دنیا پر ہماری کوششوں کا اثر ہماری طاقت پر منحصر ہے۔ صرف اس طرح ہمارے نظریات اور خیالات آخر کار دنیا کے وسیع تر حصے کے عوام تک پہنچیں گے"۔

انہوں نے مزید کہا کہ "اسلام کی حفاظت کرنے والے اُسی طرح اس کے مخالفین میں سے

ابھریں گے جس طرح حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ نکلے تھے۔ ہمیں ایک منصفانہ عالمی نظام قائم کرنا ہو گا۔ ہم مظلوموں کے ساتھ ہیں۔ ہمیں ناامید ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ آخر کار کامیابی اور کامرانی ان کے لئے ہے جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی جوابدہی سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے مخالفین کے بڑے سے بڑے حملوں سے خوف زدہ مت ہوئیے۔ اگرچہ ہمارے درمیان لمبے فاصلے ہیں، جو ہم کو ایک دوسرے سے دور رکھتے ہیں، لیکن بہرحال ہم آپس میں دینی بھائی بہن ہیں۔ ہر فرد اللہ کی بہترین تخلیق ہے۔ سچے دیندار مسلمان تمام انسانوں سے عمل میں بہتر ہوتے ہیں۔ ان کو ساری عالم انسانیت کی بہبود اور مفاد براری کی فکر کرنی ہے"۔

۲/ اپریل کو ہم نے "اوگ دیر" کی کانفرنس میں شرکت کی جو استنبول کے ایک وسیع و عریض اسکول کے بڑے کانفرنس ہال میں منعقد ہوئی۔ اس اسکول کا قیام اصلاً سنہ ۱۸۴۸ میں ٹیچرز ٹریننگ کالج یعنی "دارالمعلمین" کے طور پر ہوا تھا۔ یہ عظیم اور قدیم عمارت اب بھی پوری طرح محفوظ ہے اور زیر استعمال ہے۔ کانفرنس کا افتتاح اوگ دیر کے قومی صدر حمدی سوروجو نے کیا۔ انہوں نے کہا کہ "ہم اپنے بچوں کی پرورش اخلاقیات کے بغیر کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنا تعلیمی نظام یورپی نمونے پر نہیں بلکہ اپنی اخلاقی اقدار کے مطابق ڈھالنا چاہئے۔ اگر آپ اخلاقی اقدار سے محروم ہو گئے تو آپ کا مستقبل بھی ضائع ہو گیا"۔ انہوں نے مزید کہا: "اب نوجوان خواتین تو کام کرنے نکل جاتی ہیں۔ وہ اپنے معصوم بچوں کی تربیت کے اہم کام آیاؤں کے حوالے کر جاتی ہیں اور آیا بچوں کو ٹی وی میں مصروف کر دیتی ہے جس سے بچوں کا اخلاق بگڑ تا ہے"۔ اس کانفرنس میں، میں نے برطانوی سامراجی نظام کے دور سے ہندستان کے تعلیمی منظر نامے اور اس میں اخلاقی اقدار کے بحران کے بارے میں اظہار رائے کیا۔

لورین بوتھ نے مغربی معاشرے میں نشہ خوری، جنسی بے راہ روی اور جبری زنا جیسی قباحتوں کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ انہوں نے کہا کہ وہ سنہ ۲۰۰۸ کے ماہ رمضان میں غزہ کے شہر رفح میں پھنسی ہوئی تھیں اور تنہا تھیں۔ وہاں ان کو اسلام کے محاسن کی حقیقت کا ادراک ہوا۔ انہوں نے کہا: میں ایک مسلم خاتون کی میز بانی، تواضع اور انکسار سے متأثر ہوئی۔ ایک انتہائی غریب خاتون سے جب میں نے پوچھا کہ آپ اس حال میں بھی روزے کیوں رکھتی ہیں؟ تو انہوں نے کہا: "تاکہ مجھے مفلسوں کی بھوک کا احساس ہو سکے!"۔ سخت سردی کے موسم میں، میں ایک دوسری مسلم خاتون سے متأثر ہوئی جس کا مکان اسرائیلی بمباری سے ملبے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ انہوں نے مجھ اجنبی عورت کو اپنے گھر کے اندر مدعو کیا اور ملبے میں سے میرے لئے ایک کرسی نکال کر لائیں تاکہ میں آرام سے بیٹھ سکوں۔ پھر وہ میرے لئے ایک اوور کوٹ لائیں تاکہ میں سردی سے بچ سکوں۔ کئی

سال بعد جب میں نے اچھی طرح سمجھ کر اسلام قبول کر لیا تو اپنی نوجوان بیٹیوں کو اس کی اطلاع دی اور ان سے کہا کہ تم اپنی مرضی سے جو راہ چاہو اختیار کرو۔ تم آزاد ہو۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ واپس آکر انہوں نے مجھ سے تین سوال کئے: (۱) اگر آپ مسلم ہو گئی ہیں تو کیا پھر بھی آپ ہماری ماں رہیں گی؟ (۲) کیا آپ اب بھی شراب پئیں گی؟ (۳) کیا آپ اب بھی ایسا لباس پہنیں گی جس میں سینہ دکھائی دیتا ہے؟ میں نے ان کو جواب دیا: ہاں میں تمہاری ماں رہوں گی، لیکن میں شراب نہیں پیوں گی اور ایسا لباس پہنوں گی جس میں میرا پورا جسم ڈھکا رہے۔ ان کا جواب تھا: "موم! ہم آپ سے پیار کرتے ہیں اور آپ کے اسلام سے بھی"۔

پروفیسر زکریا عثمان نے کہا کہ افریقہ کی روایت یہ ہے کہ بچہ پورے خاندان کا ہوتا ہے۔ افریقہ کے جس حصے میں وہ رہتے ہیں اس میں اب والدین ایسے اسکولوں کو ترجیح دیتے ہیں جن میں اسلامی تعلیم بھی دی جاتی ہو۔ انہوں نے افریقہ میں دور خلافت عثمانیہ کے حوالے سے کہا کہ اب بھی وہاں ناموں کے ساتھ ترکی نام شامل ہوتے ہیں جیسے کایاس، اسلامبولی وغیرہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلافت عثمانیہ کے اثرات بہت دور دراز خطوں تک پہنچے تھے۔

ترک صحافیہ فاطمہ تنجر نے کہا کہ ہمارے والدین ان پڑھ ہونے کے باوجود موجودہ تعلیم یافتہ والدین سے بہتر تھے۔ وہ فطری طور سے جانتے تھے کہ ان کے بچوں کے لئے بہتر کیا ہے؟ سامعین میں سے ایک شخص نے تبصرہ کیا کہ آج اگر کوئی ٹیچر کسی بچے کی سرزنش کرتا ہے یا کوئی سزا دیتا ہے تو اس کے والدین اس ٹیچر کی تلاش میں دوڑے ہوئے اسکول آجاتے ہیں۔

دوسرے دن ہم "پانوراما ۱۴۵۳" دیکھنے گئے۔ یہ ایک میوزیم ہے جس میں ۵۶۳ سال قبل یعنی سنہ ۱۴۵۳ء میں ترک حکمراں محمد ثانی کے دور میں فتح قسطنطنیہ کے واقعے کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا پر اثر شو تھا جو میرے فکر و حواس کو برسوں منور کرتا رہے گا۔ فتح قسطنطنیہ دنیا کی عظیم ترین جنگی فتوحات میں شمار ہوتی ہے۔ اس سے قبل کئی مرتبہ عربوں اور ترکوں نے اس بازنطینی شہر کے مضبوط حصار کو توڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ قسطنطنیہ کے گرد غیر معمولی حصار (دیوار) کے کچھ آثار اب بھی استنبول میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ میوزیم ٹھیک اسی جگہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں ۵۳ر دن کے محاصرے کے بعد ۲۹ مئی سنہ ۱۴۵۳ کو آخری اور فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی۔ اس میوزیم میں آپ "جاں نثاری" عثمانی فوج کے خصوصی نغمے کے ساتھ جنگ کے سہ رخی مناظر کی فلم دیکھتے ہیں جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے جنگ آپ کی آنکھوں کے سامنے لڑی جا رہی ہے۔

میوزیم میں زاید از تین ہزار مربع میٹر میں حقیقی قد و قامت کی دس ہزار تصاویر نقش ہیں، جن میں جنگ کے مختلف مناظر دکھائے گئے ہیں۔ یہ نقاشی بغیر کسی حد بندی کے چاروں طرف

۳۶۰ ڈگری کے دائرے میں گھوم گئی ہے۔ اس نقاشی کو، جو بالکل حقیقی منظر پیش کرتی ہے، آپ ۱۴ میٹر کے فاصلے سے دیکھتے ہیں۔ تصاویر افقی اور عمودی دونوں طرح کی ہیں۔ نقاشی کے اوپر کا حصہ آسمان کی طرح ایک مسلسل گنبد کی صورت چاروں طرف گھوم گیا ہے۔ اس کے ساتھ صوتی تاثرات مزید ہیں۔ اصلی جنگ میں کام آنے والی توپوں، گاڑیوں اور دیگر ساز و سامان کی باقیات مرکزی چبوترے کے پاس رکھی گئی ہیں۔ ان کے درمیان کھڑے ہو کر ان مناظر کا مشاہدہ کرنے والے گھوڑوں کی ٹاپوں، تلواروں کے ٹکرانے اور اپنے کان کے قریب سے تیروں کے گزرنے کے صوتی اثرات کے زیر اثر ایسا محسوس کرتے ہیں گویا وہ میدان جنگ میں موجود ہوں۔ اس میوزیم کو ترک فنکاروں اور ماہرین نے تیار کیا ہے۔ اس کا کام سنہ ۲۰۰۵ میں شروع ہوا اور سنہ ۲۰۱۰ میں پورا ہوا۔ دنیا میں اس طرح کے ۳۰ میوزیم بنائے گئے ہیں۔ سلطان محمد نے فتح قسطنطنیہ کے بعد اپنے ''فتح نامہ'' میں لکھا کہ قسطنطنیہ کی فتح تمام مسلمانوں کی فتح ہے اور یہ شہر ہمیشہ کے لئے دنیا کے سبھی مسلمانوں کی وراثت ہے۔

مختصراً یہ کہ میرا یہ ترکی کا سفر انتہائی یادگار سفر رہا۔ اس میں مجھے حقیقی ترکی کو دیکھنے کا موقع ملا جو کہ عجلت میں کئے گئے استنبول کے سابق اسفار میں ممکن نہیں تھا۔ مزید یہ کہ مجھے ملی گوروش کی بہت سی ذیلی تنظیموں کے لیڈروں اور کارکنوں سے ملاقات کرنے اور ان کو سننے کے مواقع ملے۔ یہ ترکی کی مستحکم، مضبوط اور قابل اعتماد صالح طاقتیں ہیں جو اپنے دلوں میں ساری دنیا کے مسلمانوں کے مفادات کو انتہائی عزیز رکھتی ہیں۔

ہم نجم الدین اربکان کے بارے میں تو کافی معلومات رکھتے ہیں لیکن ان کی قائم کردہ مختلف تنظیموں کو، جو ملی گوروش کے تحت سرگرم ہیں، نہیں جانتے۔ اگرچہ اربکان وفات پا چکے ہیں لیکن ان کے افکار و نظریات، ان کے پیروکار اور ان کی قائم کردہ تنظیمیں ترکی میں پوری طرح متحرک اور سرگرم عمل ہیں۔ ان کے رضاکار مہمانوں کی آمد پر ان کے استقبال سے لے کر ان کی رخصتی تک ہر جگہ، ہر کام اور ہر انتظام میں نہایت تندہی اور خوش دلی سے مصروف نظر آئے۔ اندازہ ہوا کہ یہ رضاکار کرائے کے لوگ نہیں تھے بلکہ خود ان کی تنظیم کے ممبران تھے۔

ہم جہاں بھی گئے، جس سے بھی ملے، ہر فرد نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ اس طرح ملا گویا اپنے خاندان کے کسی گم شدہ فرد سے مل رہا ہو۔ میں نے ترکوں میں انتہائی مہمان نوازی کو محسوس کیا۔ کیرالہ کی طرح ترکی میں بھی یہ عام دستور ہے کہ جب بھی کسی دفتر میں یا گھر میں جانا ہو تو جوتے باہر اتار دیے جاتے ہیں۔ لیکن ترکی میں ایک خوشگوار تجربہ یہ بھی ہوا کہ ہم جب بھی باہر نکلے سب کے جوتے سلیقے سے قطار میں سیدھے رکھے ہوئے ملے تاکہ ان میں پیر ڈالنے اور پہننے میں مہمان کو

نہ وقت لگے اور نہ کوئی دقت ہو۔

کتابوں کی بڑی بڑی دکانیں ترکی کے ہر شہر میں ہر طرف نظر آئیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں ترکی زبان میں کتابیں خوب چھپتی ہیں اور لوگ پڑھنے کے بڑے عادی ہیں۔ نماز جمعہ میں بڑی مسجد پوری طرح سے بھری تھی اور ہمیں مشکل سے جگہ ملی۔ معذوروں کے لئے بھی مسجد کے باہر لکڑی کی بینچیں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن نماز میں مختصر ترین سورتیں یعنی معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) جلدی سے پڑھ کر نماز ختم کر دی گئی اور بہت سے لوگ سنت پڑھنے کے لئے بھی نہیں رکے بلکہ جلدی جلدی نکل جانے لگے۔ معلوم ہوا کہ یہ اس لئے کہ جمعہ یہاں کام کا دن ہے اور لوگوں کو مختصر وقت کے لئے نماز جمعہ کی چھٹی ملتی ہے۔ برسوں قبل استنبول کے ایک ہوٹل میں اتحاد علماء المسلمین کی کانفرنس تھی اور امام غالباً شیخ علی قرہ داغی تھے۔ انہوں نے نماز سے پہلے خطبہ کافی لمبا کر دیا جس کی وجہ سے ترکی لوگ ناراض ہو گئے کیونکہ ان کو جلدی سے بھاگ کر اپنے آفس پہنچنا تھا۔

استنبول اور انقرہ وغیرہ بہت خوبصورت شہر ہیں۔ ٹیلوں اور فلائی اورز اور سڑکوں کے بیچ کی جگہوں کو پھولوں اور خوبصورت پودوں سے سجایا گیا ہے۔ یہ سلسلہ میلوں چلا جاتا ہے۔ سابقہ اسفار میں، میں نے ترکی میں کوئی فقیر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اس مرتبہ مجھے چند مقامات پر سوالی نظر آئے۔ ایک مسجد کے باہر دو عورتوں کو دست سوال دراز کرتے ہوئے دیکھا۔ ان میں ایک شامی پناہ گزیں تھی اور دوسری بلغاریہ کی۔ ترکی نے اس وقت تیس لاکھ شامیوں کو پناہ دے رکھی ہے جو ترکی شامی سرحد کے قریب وسیع وعریض کیمپوں میں ٹھہرائے گئے ہیں۔ ان میں اسکولوں سمیت بہت سی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود کچھ پناہ گزیں ان کیمپوں کو چھوڑ کر ترکی کے مختلف شہروں میں رہنے چلے آتے ہیں۔

ترک پر عزم اور جوان جوش سے بھرپور ہیں۔ ان کے پاس نظریہ بھی ہے اور عزم و خلوص بھی، مگر عموماً وہ غیر ملکی زبانوں سے ناواقف ہیں۔ عالمی سطح پر وسیع تر کردار ادا کرنے کے لئے ترکوں کو دیگر زبانوں، جیسے عربی اور انگریزی وغیرہ، میں دسترس حاصل کرنی ہوگی تاکہ ان کا پیغام، ان کا نظریہ اور جذبہ دنیا کے دوسرے حصوں تک پہنچے اور وہ خود بھی دوسری اقوام کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں (انگریزی سے ترجمہ: سید منصور آغا)۔

تبصرۂ کتب

شاہ ظفر الیقین، **خطبات سر شاہ سلیمان**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۸۰، قیمت: ۳۰۰روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۴، پتہ: حافظ صاحب، مدرسہ قادریہ شمسیہ نیر آستانہ حضرت بینادل قلندر، شیخ پور، جونپور اور شاہ ظفر الیقین، پروفیسر کالونی، گیان پور، بھدوہی ۲۲۱۳۰۴، موبائل: ۹۴۵۰۲۵۵۵۶۸

انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قدرت کی نیرنگیوں کا عجب تماشا گاہ بن گیا، حکومت پر زوال آیا تو قدرتاً اندیشہ ہوا کہ نام ونشاں کب تک؟ مگر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اسی دورِ زوال میں ہندوستان کی ملت اسلامیہ میں ایسی ہستیاں نمودار ہوئیں جن کے آگے اگلے وقتوں کے مشاہیر کے کارنامے بھی ماند سے ہو گئے۔ ایسی ہستیوں میں ایک سر شاہ محمد سلیمان کا نام نمایاں ہوا۔ جن کے متعلق سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندوی کا کہنا تھا کہ سر شاہ سلیمان ہندوستان کا وقار اور مسلمانوں کا فخر تھے۔ یہ وقار اور یہ فخر ان کی اس ذہانت کی وجہ سے حاصل ہوا جو بجلی کی طرح تھی اور ان کی رگ رگ میں بھری تھی، سید صاحب نے اس ذہانت کو فطری کہا تھا اور اس لیے کہا تھا کہ ملا محمود جون پوری سر شاہ سلیمان کے مورث اعلیٰ تھے۔ جن کی بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے فلسفہ میں ادب کی اور ادب میں فلسفہ کی شان پیدا کی تھی۔ یہی خصوصیت سر سلیمان کو ملی کہ ایک طرف تو وہ میر وذوق کی مثنویوں کے مرتب تھے تو دوسری طرف آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت پر نقد و تبصرہ کرنے والے تھے۔ علم قانون کے ساتھ علم ریاضی میں بلند ترین درجہ پر بھی فائز تھے۔ مدرسہ ربانیہ فرقانیہ جونپور اور لندن کی کیمبرج یونی ورسٹی کے امتزاج نے ان کو حکمت سلیمان کے ساتھ سطوت سلیمانی جس طرح عطا کی اس کا مشاہدہ اور مطالعہ جتنا ان کے عہد میں دلچسپ اور فائدہ مند تھا، آج اس سے کہیں زیادہ اس میں دلکشی اور افادیت ہے۔ لیکن علمی بدمذاقی جب عام ہو جائے اور ذلت وزوال کا احساس ہی اٹھ جائے تو پھر قوم کے فخر و وقار کی نشانیوں پر نظر کیسے جائے؟ شاید اسی احساس زیاں نے اس کتاب کے مرتب کو سر شاہ سلیمان کے بعض نہایت اہم خطبات کو جمع کرنے کا حوصلہ دیا اور ساتھ ہی سر شاہ سلیمان کے سوانح اور احوال کو از سر نو پیش کرنے کی توفیق دی۔

خطبات صرف چار ہیں، ایک اصلاح تمدن کے موضوع پر ہے جس کو آج کل کی زبان میں اصلاح معاشرہ کہا جاتا ہے۔ یہ خطبہ انہوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اس جلسہ میں بطور

خطبۂ صدارت پیش کیا تھا جو مدراس میں ۱۹۲۷ء میں منعقد ہوا تھا۔ خدا جانے گذشتہ صدی میں تاریخ ساز خطبات کے لیے مدراس ہی کیوں راس البلاد بنتا رہا۔ کتاب کے نوے صفحات میں یہ خطبہ آیا ہے اور مختلف ابواب میں اس کو تقسیم کیا گیا ہے اور خطبہ میں ان معاشرتی اور تمدنی برائیوں پر توجہ ہے جو مسلمانوں کی راہ میں سنگ وخشت کی طرح حائل ہیں۔ شاہ صاحب نے خطبہ میں برائیوں کی جگہ موانع کا لفظ استعمال کیا اور یہ کہہ کر وضاحت کی کہ ہمارے موجودہ نظام معاشرت میں بے شمار نقص ہیں۔ اس کے بعد کی ذیلی سرخیوں ہی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس خطبہ کی اہمیت کیوں ہے؟ ''جیسے ہمارے نظام تمدن میں مذہبی عقائد پیوست ہیں، تمدنی انقلاب کی حاجت نہیں، مساوات، عالمگیر برادری، اصلاح معاشرت، تمدنی عادات جو ہماری خانگی زندگی پر موثر ہیں، قرابت قریبہ میں شادی بیاہ، نوعمری کی شادی، صرف ایک عورت سے شادی، بے جوڑ شادیاں، ارث اور ناپسندیدہ افزائش نسل، بیواؤں کی دوسری شادی، طلاق، زچہ اور بچہ، باطل پرستی کے عقائد، پردے کا رواج، مسلم عورتوں کی بے کاری، غیر صحیح اشتراک خاندان، کلب کی زندگی، تفریح، جسمانی صفائی''۔ یہ صرف پہلے باب کی سرخیاں ہیں دوسرے ابواب میں منشیات، قمار، فحش لٹریچر، سنیما، سود، اسراف، جہیز، حد سے زیادہ مہر، نکاح، طلاق اور وقف جیسے مسائل ہیں۔ آج کل وقف کا مسئلہ نہایت سنگین ہوگیا ہے۔ ۱۹۲۷ء میں بھی مسئلہ کی تہہ میں یہی خرابی تھی کہ ''پچھلے زمانہ میں وقف کی آمدنیاں، متولیوں کے خردبرد کرلینے سے بڑی مصیبت تھی، ہماری انتہائی بے اعتنائی کھلی چشم پوشی کی حد کو پہنچ گئی۔'' یقین نہیں آتا کہ ۱۹۲۷ میں یعنی قریب سو سال پہلے مذکورہ بالا موضوعات پر ایسی حکیمانہ اور اس سے زیادہ جرأت مندانہ گفتگو کی گئی۔ اس وقت سر شاہ، جج کی حیثیت سے مشہور ہوچکے تھے، اس لیے ان کے الفاظ میں غیر معمولی احتیاط وانتخاب کا سلیقہ بھی نمایاں تھا، مثلاً آغاز ہی میں لکھا کہ خوش نصیبی سے معاشرتی اور تمدنی معاملات کا کوئی تعلق سیاسیات سے نہیں، سیاسی ملحوظات درمیان نہ آنے سے دوسری جماعتوں کے حقوق کے ساتھ کوئی تصادم نہیں ہوسکتا۔ نہ دوسروں کی مذہبی سہولتوں کو خراش پہنچنے کا گمان ہے جس سے باہمی اختلافات پیش آئیں۔ یہ سو سال پہلے جج کے احساسات تھے، سو سال کے بعد حقیقتوں اور قدروں کو کس طرح بدلا گیا ہے اس کا ان خطبات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مساوات کے عنوان کے تحت بتلایا گیا کہ یہی وہ مسئلہ ہے جس میں انسانوں کی معاشی ترقی میں اسلام نے سب سے زیادہ مدد دی ہے۔ مساوات کا مطلب یہ نہیں کہ انسان قوائے اخلاقی، دماغی اور جسمانی میں مساوی ہوں۔ جو کچھ اس کا منشا ہے بس وہ اسی قدر ہے کہ ذات، رنگ، آب وہوا یا ملک کی وجہ سے کمتری کا داغ ایسا نہیں جو چھوٹ نہ سکے۔ دنیا کی شائستگی اور تہذیب میں اسلام نے صرف

ایک اصول ہی بیان نہیں کر دیا کہ سب انسانوں میں مساوات ہے بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کر دیا کہ تمام انسان باہم مساوی ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمانوں میں ذات پات ہے تو یہ سر شاہ کے نزدیک عجب تماشا ہے کہ وہاں بھی جہاں نہ تعلیم ہے نہ دولت نہ ثروت نہ درجہ نہ مرتبہ، یہ نسبی فخر کا ڈھکوسلہ موجود ہے۔

غرض یہ خطبہ پورے کا پورا آج بھی اس لائق ہے کہ اس کو علاحدہ شایع کر کے عام کیا جائے۔

دوسرا خطبہ اجمیر میں ۱۹۲۸ میں دیا گیا، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا، خطبہ صدارت میں ملک اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل، اردو اور مغربی زبانوں کی ضرورت کے علاوہ تعلیم و تدریس کے قریب ہر گوشے پر گفتگو کی گئی، تیسرا مختصر خطبہ وہ ہے جب سر شاہ سلیمان کا مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اطباء کے ایک جلسہ میں استقبال کیا گیا اور آخری خطبہ وہ ہے جو رضا سائنس اکیڈمی رام پور کے جلسہ افتتاح میں ۱۹۴۱ء میں دیا گیا۔ اس میں سائنس اور صنعت کے تعلق کی اہمیت بیان کی گئی۔ سائنس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس خطبے میں جو اشارے بلکہ صراحتیں ہیں وہ سر شاہ سلیمان کی انفرادی شان کی دلیل ہیں۔

یہ تو خطبات کا ہلکا سا ذکر ہے، کتاب میں فاضل مرتب نے جو خود سر شاہ سلیمان سے قریبی خاندانی تعلق رکھتے ہیں ساٹھ صفحات میں نہایت تحقیق و جستجو سے سر شاہ کے سوانح بیان کر دیے، شاید اتنی جامعیت سے یہ پہلی بار زیب قرطاس ہوئے۔ قوم کے ایسے قابل فخر فرزندوں بلکہ محسنوں کا ذکر تکرار و تسلسل کا طالب ہے۔ فاضل مرتب نے خاندانی نسبت کا حق ادا کیا تو پروفیسر مسعود انور علوی نے روحانی نسبت کی برکت سے نہایت موثر تحریر سپرد قلم کر دی۔ ان کا یہ کہنا حقیقت ہے کہ سر شاہ سلیمان جیسی جامع، ہمہ گیر اور فکر و نظر والی شخصیت بر صغیر میں کم یاب ہی ہے۔ عرصہ بعد اردو کے افادی سرمایہ کتب میں ایسی اچھی کتاب کا اضافہ ہوا۔ اس کے لیے فاضل مرتب شکریہ اور تحسین کے مستحق ہیں۔ (عمیر الصدیق ندوی)

مولانا عظیم الدین قاسمی غازی پوری، **تدوین سیرت اور اس کے بنیادی مآخذ و مصادر**، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۸۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مدرسہ عربیہ فیضان العلوم، بہادر گنج، غازی پور، یوپی۔

یہ مختصر رسالہ ہے لیکن اپنے موضوع پر اعلیٰ درجہ کے مطالعہ و تحقیق کی وجہ سے یہ کسی تصنیف سے کم نہیں۔ سیرت کے علم، مباحث، مترادفات، مغازی و ایام و اخبار و مشاہد نبی، اصحاب سیرت اور اصحاب حدیث کے مابین فرق مناہج، مغازی موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق پھر سیرت کی روایات کا

درجہ، جرح وتعدیل، سیرت کے باب میں اعتذاری ودفاعی گروہ پھر سیرت اور قرآن اور روایات، اہم مصادر جیسے موضوعات پر اس درجہ جامعیت اور اختصار سے نتائج مطالعہ کو پیش کرنے کا فن ہر کسی کو نہیں ملتا۔ شروع میں تدوین سیرت: آغاز وارتقا کے عنوان سے مولانا حذیفہ نوری کا مضمون ہے۔ مدارس کے طلبہ کے لیے اس رسالہ کی نافعیت میں کوئی شک نہیں، اساتذہ کے درمیان بھی یہ مقبولیت کی صلاحیت رکھتا ہے۔(ع۔ص)

ڈاکٹر عابدہ حق صبا، **باد صبا**، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت بہترین، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۸، قیمت: ۱۷۵ / روپے سن اشاعت: ۲۰۲۳، پتہ: عبدالخالق فلاحی، ۲۰۳، ۲۰۳ اوونگ گوکل کمپلیکس، اوم نگر، پوسٹ وسئی روڈ ویسٹ، ضلع پال گھر، ۴۰۱۲۰۲، مہاراشٹر، موبائل: ۹۲۲۰۵۲۴۶۴۹

اس خوبصورت مجموعۂ اشعار کی شاعرہ پیشے سے ڈاکٹر اور وہ بھی پیتھالوجی کو اپنا فن بنا کر جہاں ظاہر سے زیادہ باطن کی دنیا پر نظر رہتی ہے، صبا تخلص نے بھی اپنا اثر دکھایا، حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی طلسماتی فضا سے نکل کر امریکا کی انجان ہواؤں کو باد صبا کی پاکیزگی عطا کر دی، صنعت وتجارت اور سرمایہ ودولت کی زمین پر یہ شعر حیدرآباد کی کیا لکھنو کی یاد دلا دیتا ہے۔

بادِ صبا سے کہہ دو آہستہ رو چلے ڈوبا ہے خواب میں وہ جگایا نہ جائے گا

اشعار میں فنی خوبیوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اصل مقام تو جذبات کے اظہار کا ہے، حمد ہو نعت، غزل ہو یا نظم، عابدہ حق کا کلام زبان حق بن گیا، خاص طور پر نعتیہ اشعار جو جابجا غزلوں میں آکر غزل کو تقدس کی دولت عطا کر دیتے ہیں، بے زبانی کو زبان اور لامکانی کو مکان بنانے کا حوصلہ ہی شعر کو دل میں اتر جانے کا ہنر سکھا دیتا ہے، کتاب کی ظاہری دلکشی بھی کم نہیں اس کے لیے طابع وناشر کا ذوق بھی داد طلب ہے۔(ع۔ص)

جاوید احمد انصاری، **تاریخ زرنگار برہان پور**، کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد، صفحات ۵۰۴، ملنے کا پتہ: حمید الحق فہمی، سن اشاعت ۲۰۲۱، قیمت: ۸۰۴ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۲۶۳۶۲۸۸۵۔ ای میل: tanveerbarkati313@gmail.com

برہان پور، ہندوستان کی موجودہ ریاست مدھیہ پردیش کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ یہ مسلمان حکمرانوں کے دور حکومت کے عظیم الشان آثار وباقیات کا گواہ رہا ہے۔ اس کی گود میں علم وفضل، شعر وادب، دین وسیاست کی ایسی ایسی ہستیوں نے آنکھیں کھولی ہیں جن کے ذکر کے بغیر ہندوستان کی علمی، دینی، مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس شہر کو سلطنت فاروقیہ کے بانی نصیر خاں فاروقی نے آباد کیا۔ دو سو برس بعد تقریباً سوا سو برس یہ مغل سلاطین کے زیر نگیں رہا۔ اس کے بعد بالترتیب آصف جاہی، مرہٹی اور انگریزی حکمرانوں نے اس پر حکمرانی کی۔ اس کے

بعد ہندوستان کے آسمان نے آفتاب آزادی کی صبح دیکھی تو برہان پور نے بھی حصول حریت کے لیے اپنے حصے کا جو کردار ادا کیا کتاب میں اس کی تفصیل ہے۔

زیر نظر کتاب سے قبل برہان پور کی تاریخ پر سو سال پہلے مولانا خلیل الرحمن برہان پوری نے تاریخ برہان پور اور اس کے بہت بعد بشیر محمد خان (ایڈووکیٹ) نے تاریخ اولیائے کرام برہان پور لکھی لیکن ظاہر ہے یہ برہان پور کی مکمل اور مفصل تاریخ نہیں تھی۔ یہ قرض برہان پور کے اہل علم پر باقی تھا جس کو مصنّف نے تو اپنی وفات سے پہلے ۱۹۸۴ء ہی میں ادا کر دیا تھا لیکن بوجوہ اس کی اشاعت قریب تین سال پہلے منظر عام پر آئی اور تبصرہ کی نوبت اب آئی ہے۔ مصنّف اس سے قبل شاہکار فاروقیہ اور تاریخ آثار فاروقیہ لکھ کر سلطنت فاروقیہ کے سیاسی و تمدنی کارناموں پر نظر کا ثبوت بہم پہنچا چکے ہیں۔

مرحوم مصنّف کے پیش لفظ کے بعد پروفیسر شریف حسین قاسمی اور ڈاکٹر لیلیٰ عبدی خجستہ، ایران وغیرہ کے تاثرات نے کتاب کے اعتبار میں اضافہ کیا ہے۔ کل گیارہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں پہلے اس علاقہ سے صوبہ خاندیس اور قلعہ اسیر گڑھ کے قدیم تعلق کی نوعیت پر گفتگو کی گئی ہے اور لکھا گیا ہے کہ برہان پور پہلے صوبہ خاندیس کی راجدھانی تھی۔ خاندان فاروقیہ اور اس عہد کے علما و مشائخ، آثار و علائم پر معلومات کا دریا بہایا ہے اور آخر میں دور فاروقی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں شاہی مسجد اور اس کے متولیان وائمہ کرام، ساتویں میں مغل عہد کے امرا و سپہ سالار و صوبہ داران و مشائخ اور اس دور کے آثار اور دور مغلیہ پر تبصرہ، اس کے بعد آصف جاہی دور حکومت میں برہان پور کی مذہبی، سیاسی و تمدنی حالت کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اس عہد میں بھی کافی ترقی ہوئی اور عرصۂ دراز تک برہان پور کو مالی امداد ملتی رہی۔ مرہٹی دور میں برہان پور اور خاندیس کی مسجدوں اور درگاہوں کی وہ امداد روک دی گئی جو نظام کی حکومت میں مقرر تھی اور ہزاروں لوگ بے روزگار ہوگئے۔ مسلمان تو وہاں سے دیگر مقامات پر جا بسے لیکن ہندو کثیر تعداد میں وہاں آباد ہوگئے (ص ۳۵۶) انگریزی دور حکومت کے متعلق ہے کہ ۱۱۷۸ھ میں راجہ جیاجی راؤ سندھیا نے جھانسی کے بدلے برہان پور کو انگریزوں کے حوالے کیا۔ اس طرح یہ علاقہ ۸۲ سال تک ان کے قبضے میں رہا (ص ۳۷۷) لیکن یہ حصہ تشنہ ہے۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں آثار قدیمہ کا محکمہ قائم ہوا تو برہان پور کے قدیم آثار اس محکمے کے تحت آ گئے۔

کتاب میں برہان پور کی سیاسی سے زیادہ اس کی ادبی، تمدنی اور ثقافتی تاریخ کو پھیلا کر پیش کیا گیا ہے۔ مصنّف کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کے اندر بعض مقامات پر پیش رو مؤرخین کے بیانات سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثلاً راجہ علی خاں کے متعلق متعدد مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ اکبر کی

باجگذاری قبول کر کے لفظ شاہی کا استعمال اپنے نام کے ساتھ نہیں کرتا تھا اور خطبہ بھی اکبر ہی کے نام کا جاری کرا دیا تھا۔ مصنّف لکھتے ہیں یہ غلط ہے۔ راجے علی خاں خود مختار فرماں روا تھا۔ اس نے اپنا سکہ چلایا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور خطاب شاہی سے بھی مشہور ہوا۔ اس کی شہادت انہوں نے متعدد ذرائع کتبات و آثار سے پیش کی ہے۔ (ص ۱۲۸)

تاریخ نگاری ایک مشکل کام ہے۔ مصنّف نے کتابوں کی ورق گردانی، مساجد و مقابر، قلعے و محلات، خانقاہوں، سرایوں، شفاخانوں اور ان کے کتبات کا تاریخی و تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ نہایت دقت نظری و باریک بینی سے کیا ہے۔ گو کہ عہد مغل کے عبدالرحیم خانخاناں اور اورنگ زیب وغیرہ جیسی اہم سیاسی شخصیات کا اس علاقے کی ادبی و تمدنی ترقی میں کردار کم اہمیت کا حامل نہیں ہے لیکن کتاب کا سب سے اہم اور طاقتور حصہ سلاطین فاروقیہ کے ۲۳۰ سالہ دور حکومت کی تفصیل ہے۔ کسی کتاب میں فاروقی دور سے متعلق یکجا اتنا مواد شاید ہی ملے جتنا اس میں ہے۔ عربی و فارسی کتبات کے اردو ترجمے نے ان کو سمجھنے کی مشکل حل کر دی ہے۔ شاہی مسجد برہان پور کے تین کتبات میں ایک کتبہ سنسکرت میں ہے۔ جو کتاب کے ص ۲۰۹ پر مع اردو ترجمہ درج ہے۔ اس سے مسلمان بادشاہوں کی بے تعصبی و رواداری پر مہر لگتی ہے۔ اس کے علاوہ مصنّف نے خود اپنے عہد کے جو علمی، تعلیمی، سیاسی و سماجی حالات درج کیے ہیں وہ خود کتاب کی انفرادیت کا ثبوت ہیں۔ معلومات کی فراہمی میں دیانت داری اور انصاف پسندی سے کام ضرور لیا گیا ہے لیکن تاریخی مواد کے حوالے کے لیے آخر میں صرف غیر مکمل کتابیات کافی نہیں ہے۔ بہر حال کتاب زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے عمدہ ہے۔ امید یہی ہے کہ اہل علم و ادب اس سے ضرور استفادہ کریں گے۔ (**کلیم صفات اصلاحی**)

توضیح

پچھلے شمارے میں جناب کلیم صفات اصلاحی نے میری کتاب "اصول تحقیق" کے تیسرے ایڈیشن پر تبصرہ کیا ہے۔ چھپنے سے پہلے میں نے اسے دیکھا تھا اور جہاں واضح غلطی نظر آئی اسے درست کر دیا تھا جیسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جگہ جامعہ اسلامیہ یا جامعۃ الامام کی جگہ جامعۃ الأم لکھا گیا تھا لیکن میں نے کتاب پر ان کی رائے زنی کو نہیں بدلا اور نہ ہی کہیں حاشیہ لگایا۔

انھوں نے کچھ "بظاہر تضاد" کا ذکر کیا ہے جیسے میں نے کتاب میں لکھا ہے کہ "التلمود" اور "تاریخ فلسطین القدیم" کے لکھتے وقت فن تحقیق کے متعلق میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی لیکن پھر بھی میری رائے میں وہ دونوں کتابیں فنی طور پر معتبر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتابیں تو میں

بہت عرصے سے پڑھ رہا تھا، خصوصاً انگریزی کتابیں جہاں ان امور کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ میں نے دیکھ دیکھ کر وہیں سے سیکھا تھا کہ اپنی بات کیسے رکھی جائے، کاما، فل اسٹاپ (اردو میں ڈیش)، حواشی اور انڈنٹ (حوض) وغیرہ کا استعمال کیسے کیا جائے۔ اور اس سمجھ کا انعکاس ان دونوں کتابوں میں نظر آتا ہے۔

اسی طرح انھوں نے اعتراض کیا ہے کہ جب میں کتاب میں "کتابیات" کی اہمیت بتا رہا ہوں تو خود میری اپنی کتاب "کتابیات" سے کیوں عاری ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے "دلیل الباحث / اصول تحقیق" کسی کتاب / کتابوں کو پڑھ کر نہیں لکھی ہے بلکہ اپنے تجربے کی بنیاد پر لکھی ہے اور مقدمے میں ہی ذکر کر دیا ہے کہ میں نے اپنے ذاتی تجربے کے علاوہ مانچسٹر یونیورسٹی میں اپنے پروفیسر بوزورتھ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ان کے لکچر کسی کتاب پر مبنی نہیں ہوتے تھے بلکہ زبانی یا کچھ ٹائپ شدہ نوٹس پر مبنی ہوتے تھے۔

ایک حوالے کے بارے میں فاضل مبصر نے تصحیح کی ہے میں نے المطبعۃ المصریۃ بولاق کی جگہ صرف "مطبع بولاق" لکھا ہے۔ درحقیقت اہل علم کے نزدیک "مطبع بولاق" لکھنا ہی کافی ہے۔ مطبع بولاق درحقیقت مصری حکومت کا سرکاری پریس تھا اور اس کو المطبعۃ المصریۃ نہیں (جیسا کہ مبصر نے لکھا ہے) بلکہ المطبعۃ الأمیریۃ (یعنی سرکاری یا حکومتی پریس) کہا جاتا تھا اور یہ قاہرہ کے شمال میں واقع گاؤں بولاق میں واقع تھا جو اب شہر کے بڑھنے کی وجہ سے شہر کا ایک حصہ بن چکا ہے اور وہ قدیم پریس بھی کب کا ختم ہو چکا ہے۔ یہاں یہ توضیح ضروری ہے کہ ابن خلدون کی کتاب "العبر..." جب بولاق سے شائع ہوئی تھی تو اس پریس کا نام دار الطباعۃ الخدیویۃ تھا (مصر کے حاکم کو خدیو کہا جاتا تھا)۔

تبصرہ نگار کو کتاب میں ریسرچ اور رِسرچ کے استعمال پر بھی اعتراض ہے اور ان کے خیال میں ریسرچ 'یا' کے ساتھ ہونا چاہئے۔ یہ ضرور پروف ریڈنگ کی غلطی ہے ورنہ صحیح لفظ رِسرچ ہی ہے نہ کہ ریسرچ۔ رِسرچ کے معنی گہری تحقیق کے ہیں جبکہ "ری سرچ" کے معنی دوبارہ تحقیق کے ہیں۔ اردو کے بعض پروفیسر حضرات سمجھتے ہیں کہ کسی موضوع کی دوبارہ تحقیق ہی "رِسرچ" ہے اور وہ وائیوا میں طالب علم سے پوچھتے ہیں کہ اس میں تم نے کیا "نئی تحقیق" کی ہے! (ظفر الاسلام)

ادبیات

نعت نورِ رسالت ﷺ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

گوشۂ مطالعاتِ نعت، علی گڑھ

موبائل نمبر: ۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷

نوری نوری گفتگو آقاؐ کی ، لہجہ نور کا
فقرہ فقرہ اس کتابِ نور کا، تھا نور کا

اللہ اللہ، سرورِ دیںؐ کا جمالِ بے مثال
ایسا لگتا تھا کہ ہو جیسے سراپا نور کا

چہرۂ آقاؐ ہو کیسے نقش پھر قرطاس پر
ماڈّی ہیں سارے کاغذ اور وہ چہرہ نور کا

نور تھی اک اک صفت آقاؐ کی عالم کے لیے
فی الحقیقت جسمِ اطہر، گو نہیں تھا نور کا

تھا اندھیرا ہی اندھیرا دہر میں جب چار سو
اپنے بندوں کو دیا خالق نے تحفہ نور کا

ہر طرف عالم میں پھیلی نورِ حق کی روشنی
آئے تھے پیغام لے کر میرے آقاؐ نور کا

نور کا دریا رواں ہے کعبے میں آٹھوں پہر
اور یونہی طیبہ میں بھی بہتا ہے دریا نور کا

ایک مرکز تک نہیں محدود نورانی فضا
ہے مدینے کی زمیں کا چپّا چپّا نور کا

یہ بھی آقاؐ کے صحابہؓ کی ہے اک روشن مثال
چاند کے چاروں طرف ہو جیسے ہالہ نور کا

نوری تعلیماتِ آقاؐ پر کرے دل سے عمل
جس کو ہو مطلوب جنت میں ٹھکانا نور کا

شرطِ طیبہ کے سفر میں ہے صفائے قلب و روح
نور کے بازار میں چلتا ہے سکّہ نور کا

خواب ہی میں کاش میں دیکھوں وہ روئے خوش جمال
چاندنی سے چاند کی بڑھ چڑھ کے جو تھا نور کا

میرے لب پر نعت ہے نورِ رسالت کی رئیسؔ
آرزوئیں نور کی اور میرا جذبہ نور کا

معارف کی ڈاک

معارف، نومبر ۲۰۲۴ کا شمارہ فی الوقت پیش نظر ہے۔ اکتوبر کے شمارے میں شائع شدہ اختر النساء کے مقالے پر لکھا گیا میرا مراسلہ آپ نے نومبر کے شمارے میں شائع کیا، شکریہ۔ آپ نے میرے دوسرے خط میں میری گزارش کے باوجود خط کشیدہ جملے کو شائع کر دیا۔ میری رائے میں یہ اخلاقیات کے منافی تھا۔ بہر کیف! میں نے یہ مراسلہ "معارف" کے گرتے معیار کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھا تھا۔ میں تقریباً پچھلے چالیس برسوں سے معارف کا قاری ہوں اور اس کے اعلیٰ علمی معیار سے واقف ہوں۔ آپ نے بجا فرمایا ہے کہ "۔۔۔(معارف)، جس نے برسوں کی طویل محنت سے علمی دنیا میں ایک شناخت بنائی ہے، اور جو اردو دنیا کا قدیم ترین علمی مجلہ ہے۔۔۔" تقریباً یہی بات میں نے بھی اپنے مراسلے میں لکھی تھی اور آپ سے یہ گزارش کی تھی کہ مقالہ شائع کرنے سے قبل مقالے کو کسی اکسپرٹ کے پاس بھیج کر اسے شائع کرنے کے قابل بنالیں، پھر شائع کریں۔

"معارف" کا شمار جب سے UGC Care List میں شامل ہوا ہے، ریسرچ اسکالرز اپنا APR بڑھانے کے لیے مقالات بھیجتے ہیں اور آپ ان پر تنقیدی نظر ڈالے بغیر شائع کر دیتے ہیں۔ مثال کے لیے میں پچھلے چند شماروں میں شائع شدہ ایسے مقالات کی نشاندہی کر رہا ہوں جن میں اطلاعات غلط ہیں، ناقص ہیں یا نامکمل ہیں۔ جن غلطیوں یا خامیوں کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں، اگر اشاعت سے قبل ایسے مقالات کو اس موضوع کے متخصصین کے پاس بھیج دیے جاتے تو ایسی غلطیاں نہیں ہوتیں اور پھر معارف کے معیار پر کسی کو انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ملاحظہ فرمائیں چند مقالات کی غلطیاں و کمیاں:

(۱) ہندو شعراء اور نعت گوئی از محمد فرحت حسین (معارف نومبر ۲۰۲۴): مقالہ نگار موصوف نے اس موضوع پر فقط دو کتابوں (۱) فانی مرادآبادی کی "ہندو شعراء کا نعتیہ کلام" اور (۲) محمد محفوظ الرحمن کی تصنیف "ہندو شعراء دربار رسول میں" کی مدد سے سات ہندو شعراء کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ اس میں کیا نئی بات کی گئی ہے، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ دو کتابیں سامنے رکھ کر اس طرح کے مقالے لکھے جائیں گے تو کیا یہ 'معارف' میں اشاعت کے قابل ہوں گے؟

(۲) رامپور رضا لائبریری میں مغلیہ عہد کی یادگاریں از ڈاکٹر تبسم صابر (معارف مارچ ۲۰۲۴ء): اس مقالے میں موجود خامیوں اور کمیوں کی طرف عارف نوشاہی صاحب نے اپریل ۲۰۲۴ء کے شمارے میں ایک مراسلے کے ذریعہ اشارہ کر دیا تھا۔ ایک خامی کی طرف وہ بھی اشارہ

کرنا بھول گئے کیونکہ انھوں نے رضا لائبریری میں موجود شہنشاہ بابر کے ترکی دیوان کی غالباً زیارت نہیں کی ہے لہذا اُن کا ذہن اس طرف نہیں گیا۔ مقالہ نگار نے لکھا کہ "رامپور رضا لائبریری میں بابر کا ترکی دیوان محفوظ ہے جس پر جابجا بابر بادشاہ کے قلم سے اصلاحیں ہیں اور آخر میں ایک رباعی خود بابر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔۔۔شاہجہاں نے اس کے آخری صفحے پر رباعی کے پاس یہ وضاحت کی کہ صرف یہ ترکی رباعی بابر بادشاہ کے قلم سے ہے۔"

جب 'صرف' کا لفظ شاہجہاں نے استعمال کیا تو مقالہ نگار کا یہ لکھنا کہ "جابجا بابر بادشاہ کے قلم سے اصلاحیں ہیں" کہاں تک درست ہے؟ حقیقت بھی یہی ہے کہ اس نسخے پر بابر کی اصلاحیں نہیں ہیں صرف ایک رباعی اُس کے قلم سے ہے۔ اس نسخے کو سب سے پہلے سر ڈینی سن راس نے ۱۹۱۰ء میں جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں شائع کیا تھا۔ اب اس کی رنگین عکسی اشاعت ۲۰۱۴ء میں رامپور رضا لائبریری سے کردی گئی ہے۔

(۳) سیرت نگاری اور سرسید احمد خاں از منیب احمد و شبیر مقبول ماگرے، (معارف اکتوبر ۲۰۲۳): مقالہ نگار نے لکھا "یہ (خطبات احمدیہ) ایک ضخیم کتاب تھی جو ۱۸۷۰ء میں مکمل ہوئی اور اسی سال شائع ہوئی۔ ۵۴۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا نام "خطبات احمدیہ" رکھا گیا۔" (ص۱۶) مقالہ نگار جس کتاب کا ذکر کررہے ہیں اس کا نام "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرة المحمدیة" ہے اور یہ کتاب سب سے پہلے ۱۸۷۰ میں نہیں بلکہ سرسید کی "تصانیف احمدیہ" کی پہلی جلد کے حصہ دوم میں ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی تھی۔۔ ۱۸۷۰ میں اس کا انگریزی ورژن لندن سے شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا: A Series of Essays on the Life of Mohammad and Subjects Subsidiary Thereto

یہ ساری تفصیل سرسید نے ۱۷ / دسمبر ۱۸۶۹ء کو اپنے ایک خط میں محسن الملک کو لکھی تھی۔ وہ خط ملاحظہ فرمائیں:

"اب اس کتاب کا حال سنیے جو تصنیف ہورہی ہے۔ جس کا نام آپ تجویز کردیجیے۔ انگریزی میں اس کا نام ہے "سیریز [۱] ایسیز آف [۲] دی لائف آف محمد" اور عربی میں اس کا نام میں رکھنا

---

(۱) اصل کتاب میں سیریز کے بعد آف of ہے۔

(۲) اصل کتاب میں آن on ہے۔

چاہتا ہوں: "خطبات احمدیہ علیٰ سیرۃ محمدیہ"۔ میں نہیں جانتا کہ ناموں پر الف لام لانا جائز و صحیح ہے یا غلط۔ یعنی اگر بجائے نام مذکورہ بالا کے یہ نام رکھا جاوے تو دل کو اچھا معلوم ہوتا ہے: "خطبات الاحمدیہ علی السیرۃ المحمدیہ" اور یہ نام بھی ہو سکتا ہے: "خطبات احمدیہ علی سیرۃ سیدنا محمد رسول اللہ"، "خطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ المحمدیہ"۔ یہ اخیر کا نام اگر بموجب قواعد نحویہ کے صحیح ہو تو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ بہر حال آپ تجویز کر کے جلد بھیج دیں کیونکہ اس خط کا جواب آنے تک اس کی پہلی جلد ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور چھپ جاوے گی۔ مگر خیال رہے کہ نام میں لفظ 'خطبات' ضرور ہو اس لیے کہ میں نے ہر ایک حصہ کو بلفظ خطبہ تعبیر کیا ہے۔ پہلی جلد میں بارہ خطبے ہیں جو سب مرتب ہو چکے ہیں۔ برابر چھپ رہے ہیں۔" (بحوالہ کلیاتِ مکتوباتِ سرسید، جلد اول، مکتوب نمبر ۱۲۴، مرتبہ عطا خورشید، لکھنؤ، ۲۰۲۳ء)

تصانیف احمدیہ میں شائع ہونے والی سرسید کی تصنیف "الخطبات الاحمدیہ ------ "۴۵۷ صفحات پر مشتمل نہیں بلکہ ۴۵۸ صفحات (ص ۱۸۲ سے ۶۳۹ تک) پر مشتمل ہے۔ "تصانیف احمدیہ" کے بعد کتابی صورت میں یہ ۱۹۰۰ء میں مطبع فیض عام، علی گڈھ سے شائع ہوئی، جس میں صفحات کی تعداد ۷۰۰ ہے۔

(۴) غبار خاطر اور خطوط غالب کے مشترکہ عناصر از ڈاکٹر مشیر احمد (معارف اکتوبر ۲۰۲۳ء): مقالہ نگار کا پہلا جملہ ہی غلط اطلاع پر مبنی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے تین مجموعے کاروان خیال، نقش آزاد اور غبار خاطر ہیں۔" صرف تین نہیں بلکہ ان تین کے علاوہ تقریباً آدھے درجن سے زیادہ آزاد کے خطوط کے مجموعے ہیں جنھیں مختلف موقعوں پر مختلف لوگوں نے جمع کر مرتب کیا ہے۔ اشاعت کی تاریخ کے اعتبار سے تفصیل ذیل میں پیش ہے:

۱۔ تبرکات آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر (لاہور، ۱۹۵۹ء، ۳۹۶ص)

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات آزاد مرتبہ محمد اجمل خاں (دہلی، ۱۹۶۶ء، ۴۰۰ص)

۳۔ نوادر ابوالکلام: سردار محمد اکبر خاں کے نام مولانا آزاد کے خطوط، مرتبہ ظہیر احمد خاں ظہیر (کیمبل پور، ۱۹۶۶ء، ۷۷ص)

۴۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری، (کراچی، ۱۹۶۸ء، ۴۰۸ص)

۵۔ افادات آزاد، مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری (کراچی، ۱۹۸۴ء، ۲۰۰ص)

۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد: آثار و افکار (محمد ابراہیم زکریا عرف مسٹر صاحب کے نام مولانا آزاد

کے خطوط) مرتبہ محمود واجد ہاشمی (کراچی، ۱۹۹۰ء، ۱۲۰ص)

۷۔ خطوط آزاد مرتبہ ڈاکٹر راجیش کمار پرتی (نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ۱۶۰ص)

۸۔ آثار و نقوش (نیشنل آرکائیوز، دہلی میں محفوظ مولانا آزاد کے تاریخی وسیاسی خطوط)، مرتبہ ابو سلمان شاہجہانپوری، (کراچی، ۱۹۹۷ء، ۲۳۱ص)

۹۔ مکاتیب ابوالکلام، مرتب نامعلوم الاسم (لاہور، ب-ت، ۲۰۰ص)

(۵) ۔ قاضی ابوسعید سیرافی اور ان کی تصنیف اخبار النحویین البصریین از مولانا کفیل احمد میواتی قاسمی (معارف نومبر ۲۰۲۱ء) : اس مضمون پر ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب کا مراسلہ فروری ۲۰۲۲ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے نمونے کے طور پر جن فاش غلطیوں کا ذکر کیا ہے ان سے پورا مضمون مشکوک ہو جاتا ہے۔ جو مضمون نگار سیرافی (م: ۳۶۸ھ) کی وفات کے تقریباً چار سو سال بعد پیدا ہونے والے ابن جماعہ (۷۴۹ھ-۸۱۹ھ) کو سیرافی کا شاگرد اور پانچ سو سال بعد پیدا ہونے والے تقی الدین شمنی (م: ۸۷۲ھ) کو سیرافی کا استاد قرار دے، نیز ابن درید کی کتاب کا نام 'جمہرۃ اللغۃ' کی جگہ 'جمہرۃ انساب العرب' لکھے، جرمن مستشرق 'کرنکو' کو جاپانی مستشرق لکھے، اُس کی تحریر پر کیونکر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

یوں تو معارف کے بیشتر شماروں میں اس طرح کی کمیاں اور خامیاں دَر آئی ہیں لیکن اِس وقت ان کا شمار کرانا مقصد نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر رطب و یابس کو شائع کر دینا معارف کے معیار کے منافی ہے۔ اس سلسلے میں دو تین تجاویز میں رکھنا چاہتا ہوں:

۱۔ اشاعت کے لیے جو بھی مقالے آئیں، ان میں سے معیاری مقالات کو منتخب کریں۔ انتخاب کرنے کے لیے اپنے ہی ادارے کے دو تین لوگوں کا بورڈ بنالیں جو معیاری مقالات کا انتخاب کریں۔

۲۔ ہر ماہ کے شمارے میں ایک صفحے پر مقالہ نگاران کے لیے ایک گائیڈ لائن شائع کریں جس میں اس بات کا ذکر ہو کہ:

(الف) مقالہ کسی نئے اور اچھوتے موضوع پر ہو یا کسی سابقہ مطالعے کی تنقیح و تصحیح پر مبنی ہو۔

(ب) تمام بیانات و مباحث کے ساتھ مآخذ و مصادر کی نشاندہی کی جائے۔ حوالہ جات اسی صفحے پر حاشیے میں اور آخر میں کتابیات کا اندراج ہو۔ (حوالہ جات اور کتابیات کا فرق بھی مقالہ نگار کو معلوم ہونا چاہیے مثلاً شیخ جمیل علی نے اپنے مقالے "بین المذاہب مکالمے میں اسلامی تصوف کا کردار" (اپریل ۲۰۲۴ء) کے آخر میں "حوالہ جات" لکھ کر "کتابیات" دی ہے، اس میں بھی اندراجات غلط ہیں یعنی سارے اندراجات ڈاکٹر، مولانا، پروفیسر وغیرہ سے درج کیے گئے ہیں

جو درست نہیں)۔

نئے لکھنے والوں کی آپ ضرور ہمت افزائی کریں لیکن ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کے اصول بھی بتائیں۔ اس کے لیے آپ نئے لکھنے والوں کو اپنی کتاب "اصول تحقیق: جدید ریسرچ کے اصول وضوابط" دیکھنے کی بھی سفارش کرسکتے ہیں۔

بورڈ کے ذریعہ مقالات کے انتخاب کے بعد اسے اس موضوع کے اکسپرٹ کے پاس ضرور بھیجیں تاکہ وہ ان کی کمیوں، خامیوں کو دور کرسکیں نیز مزید اطلاعات کا اضافہ کرسکیں۔

آخر میں پروف ریڈنگ پر ضرور دھیان دیں، ورنہ مقالہ نگار کو اپنے ہی مقالے کی اشاعت کے بعد اگلے شمارے میں اس کی اصلاح کرنی پڑتی ہے مثلاً ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی صاحب کے مقالے "جزاور جزو کی بحث" (مارچ ۲۰۲۴) کی پروف ریڈنگ اس کے اگلے شمارے (مئی ۲۰۲۴) میں خود مقالہ نگار نے کی۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی کو اپنے مراسلے (اپریل ۲۰۲۴) کے پروف کی اصلاح کے لیے مزید ایک مراسلہ لکھنا پڑا (دیکھیے مئی ۲۰۲۴ء کا شمارہ)۔

عطاخورشید، علی گڑھ

Atakhursheed2012@gmail.com

(۲)

ا۔ آپ کی ادارت میں "معارف" اپنی رفتار سے چل رہا ہے غنیمت ہے۔ خدائے تعالیٰ بہتر توفیقات سے مدد فرمائے۔ (آمین)

۲۔ آپ کی ترمیمات و تجدیدات پر کچھ لکھ کر آپ کے وقت اور ذہن کو مشوش کرنا خلافِ ادب ہوگا، اس لیے کفِ قلم کرتا ہوں۔ بہرحال جو ہے سو خوب ہے۔

۳۔ اتفاق سے اس وقت میرے سامنے "معارف" مئی ۲۰۲۴ء کا شمارہ رکھا ہوا ہے، جس کے ص ۲۵ تا ص ۵۰ پر فارسی کے ۲۳ قطعات اور ۱۲۲ (فارسی) اشعار چھپے ہوئے ہیں، پھر میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا ہوں کہ آخر آپ نے میرے فارسی اشعار پر کیوں قدغن لگا رکھی ہے؟ جبکہ چالیس سال بلکہ تقریباً پچاس سال سے میرے فارسی کے چند شعر کسی کسی شمارے میں شائع ہوتے رہے ہیں (جن کی دو سال کی مجموعی تعداد بھی اتنی نہیں ہوتی، جتنی مئی کے ایک شمارے میں موجود ہے!)۔ (یہ آپ میری نہیں بلکہ ہندوستان کی پوری فارسی دنیا کی توہین کررہے ہیں، اس لیے کہ اس وقت پورے ہندوستان میں فارسی زبان کا میں سب سے مستند نمایندہ ہوں، جس کی نثر و نظم کو ایران کے اہلِ علم و ادب تسلیم کرتے ہیں۔ میری کتابیں تہران میں شائع ہوئی ہیں اور وہاں (ایران) کے ادبا

و محققین نے ان پر تحسینی تبصرے تحریر کیے ہیں)[۳]۔

۴۔ کئی ماہ قبل حضرت حسّان بن ثابت الانصاری رضی اللہ عنہ کے بعض قصائد کے اشعار کا منظوم اردو ترجمہ ارسالِ خدمت کیا تھا جس کی رسید بھی آپ نے موبائل پر عطا کرنے کی زحمت فرمائی تھی، اشاعت کا انتظار ہے!

رئیس احمد نعمانی۔ علی گڑھ
موبائل نمبر: ۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷

(۳)

شکر گزار ہوں کہ آپ نے "معارف" (نومبر) عطا فرمایا ہے۔ سبھی مضامین قیمتی اور معلومات افزا ہیں۔ تاہم، ہندو نعت گو شعرا کے تذکرے پر مشتمل مضمون اس شمارے کی جان ہے۔ یہ بات کہنے کا پس منظر، ہند میں پھیلی مسلم کُش فضا اور وقتاً فوقتاً رسول کریم کی شان میں گستاخی کے مخصوص انداز میں، غیر مسلم اہل قلم کے اعتراف عظمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تازہ کرنا بہت بڑی خدمت ہے۔ اگر ممکن ہو تو "معارف" کے گزشتہ شماروں میں شائع ہونے والے ایسے مقالات کی فہرست شائع کی جائے۔ اور ممکن ہو تو اُن ہندو اور سکھ مصنفین کی کتب کی وضاحتی فہرست شائع کی جائے، جنھوں نے خاص طور پر اردو میں رسول کریم کی ذات اقدس پر لکھا۔ اس اعتراف کی ضرورت مسلمانوں کو تو نہیں، مگر ہند میں بسنے والے غیر مسلم حضرات کی یادداشت کو اس طرح تازہ کرنا ضروری ہے۔ اگر ممکن ہو تو طے کر کے مارچ یا اپریل ۲۰۲۵ کا ایک شمارہ اسی موضوع کے لیے مختص کرنے کا سوچا جاسکتا ہے۔

سلیم منصور خالد، لاہور

123ubm@gmail.com

معارف: ان شاء اللہ کوشش کی جائے گی کہ اس طرح کی مزید تحریریں شائع ہوں اور ایسے مقالات کی فہرست بھی شائع ہو۔

---

[۳] معارف میں اردو کے علاوہ کسی اور زبان کی تخلیقات شائع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے وہ بھی کسی ایسی زبان میں جسے شاید ہی ہمارا کوئی قاری پڑھتا ہو۔۔ ہمارے صفحات بہت مختصر ہیں، بہت کچھ نہیں چھپ پاتا ہے (مدیر)

رسید کتب موصولہ

ذاکر حسین ذاکرؔ، **اردو صحافت کا آغاز وارتقاء**: پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات:۳۲۷، سالِ اشاعت: ۲۰۲۴ء، قیمت: ۹۹۹روپے، موبائل نمبر :۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

عبد الغنی شیخ، **اسلام اور سائنس**: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، صفحات:۱۸۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر :۹۹۵۳۶۳۰۷۸۸

ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی، **تاج الاولیاء تاجدار ناگپور**: نیا بازار کامٹی، ناگپور، صفحات:۸۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر :۹۳۷۰۱۶۹۵۷۱

علامہ ثناء اللہ امرتسریؒ، ڈاکٹر بہاء الدین محمد سلیمان (پیش کش) ، **تغلیب الاسلام بر تہذیب الاسلام**: الدار الاثریہ، نئی دہلی، صفحات:۳۶۷، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت:۵۰۰روپے، موبائل نمبر : ۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵

انیس چشتی، **جنگ آزادی اور مسلمان**: ایسٹرن بیورو آف بکس اینڈ ریسرچ، پونہ، صفحات: ۶۸، سالِ اشاعت ۲۰۱۰ء، قیمت:۶۰روپے، موبائل نمبر :۹۸۹۰۰۸۷۷۷۹

ابو صادق عاشق علی اثری، **حقوق والدین قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں**: الدار الاثریہ، اثری منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات:۱۹۲، سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: درج نہیں، موبائل نمبر: ۸۰۱۰۶۳۶۳۵۵

مولوی قمر الزماں مبارکپوری، اختر الزماں مبارکپوری (مرتب)، **سخنوران اعظم گڑھ (جلد سوم خ-س)**: وہاج پبلی کیشنز، مبارکپور، اعظم گڑھ، صفحات: ۵۶۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۸۰۰روپے، موبائل نمبر :۸۱۲۷۰۱۶۷۳۸

مولانا اعجاز احمد اعظمی، مولانا ضیاء الحق خیر آبادی (مرتب)، **کھوئے ہوؤں کی جستجو**: مکتبہ عکاظ، دیوبند، صفحات:۸۸۸، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۸۸۰روپے، موبائل نمبر :۹۲۳۵۳۲۷۵۷۶

مولانا عبد القادر فاتی والا، **مقامات رحیمی**: مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، سہارنپور، صفحات: ۳۸۴، سالِ اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت: ۴۰۰روپے، موبائل نمبر :۹۴۶۰۸۶۶۱۳۰

محمد نعمان، **نایاب ہیں ہم (خاکے اور یادیں)**: جوہری فارم، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات:۱۷۶، سالِ اشاعت ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۵۰روپے، موبائل نمبر :۹۸۹۱۴۲۴۰۹۵

تصانیف علامہ سید سلیمان ندویؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
خطبات مدراس	150/-	سلسلۂ سیر الصحابہ،	
رحمت عالم	60/-	**تابعین وتبع تابعین**	
سیرت عائشہؓ	250/-	سیر الصحابہ اول (خلفائے راشدین)	320/-
حیات شبلیؒ	800/-	سیر الصحابہ دوم (مہاجرین اول)	200/-
یادرفتگاں	350/-	سیر الصحابہ سوم (مہاجرین دوم)	300/-
بہادر خواتین اسلام	40/-	سیر الصحابہ چہارم (سیر الانصار اول)	300/-
تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	550/-	سیر الصحابہ پنجم (سیر الانصار دوم)	200/-
عربوں کی جہاز رانی	160/-	سیر الصحابہ ششم (امام حسنؓ.....کے حالات)	200/-
عرب وہند کے تعلقات	200/-	سیر الصحابہ ہفتم (اصاغر صحابہ)	300/-
برید فرنگ	150/-	سیر الصحابہ ہشتم (سیر الصحابیات)	100/-
سفرنامۂ افغانستان	100/-	سیر الصحابہ نہم (اسوۂ صحابہ اول)	260/-
انتخابات شبلی	200/-	سیر الصحابہ دہم (اسوۂ صحابہ دوم)	300/-
نقوش سلیمانی	350/-	سیر الصحابہ یازدہم (اسوۂ صحابیات)	75/-
خیام	220/-	اہل کتاب صحابہ وتابعین	210/-
ارمغان سلیمان	250/-	تابعین	250/-
رسالہ اہل سنت والجماعت	30/-	تبع تابعین اول	230/-
دروس الادب (اول)	15/-	تبع تابعین دوم	320/-
دروس الادب (دوم)	20/-	****	

DEC 2024 Vol- 211(12) ISSN 0974-7346 Ma arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 **MA ARIF** AZM/NP- 43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org